اسلام، جمہوریت اور پاکستان

مفکر اسلام

حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب

ملکی سیاست اور مذہبی جماعتوں کا مخمصہ

ملکی سیاست میں حصہ لینے والی مذہبی جماعتیں اس وقت عجیب مخمصے میں ہیں اور ریگستان میں راستہ بھول جانے والے قافلے کی طرح منزل کی تلاش بلکہ تعین میں سرگرداں ہیں۔ مروجہ سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کرتے وقت مذہبی جماعتیں یقیناً اپنے اس اقدام پر پوری طرح مطمئن نہ تھیں اور وہ خدشات و خطرات اس وقت بھی ان کے ذہن میں اجمالی طور پر ضرور موجود تھے جن سے انہیں آج سابقہ درپیش ہے۔ مگر ان کا خیال تھا کہ مروجہ سیاست میں شریک کار بنے بغیر ملکی نظام میں تبدیلی کی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی، اور یہ کہ مروجہ سیاست کی خرابیوں پر وہ مذہبی قوت اور عوامی دباؤ کے ذریعہ قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے، اس لیے مذہبی جماعتوں نے مروجہ سیاست کی دلدل میں کودپڑنے کا رسک لے لیا۔ لیکن آج ووٹ، الیکشن اور دباؤ کی سیاست ان کے گلے کا ہار بن گئی ہے کہ

نہ تو انہیں اس کے ذریعہ دینی مقاصد کے حصول کا کوئی امکان نظر آرہا ہے،

نہ وہ اس سے کنارہ کش ہونے کا حوصلہ رکھتی ہیں،

نہ اس مروجہ سیاست کے ناگزیر تقاضوں کو پورا کرنا ان کے بس کی بات ہے،

اور نہ ہی وہ قومی سیاست میں اپنے موجودہ مقام اور بھرم کو باقی رکھنے میں کامیاب ہو رہی ہیں۔

اور صورت حال یہ ہے کہ قومی سیاست کی ریت دینی رہنماؤں کی مٹھی سے مسلسل پھسلتی جا رہی ہے اور قومی سیاست میں بے وقعت ہونے کے اثرات معاشرہ میں ان کے دینی وقار و مقام کو بھی لپیٹ میں لیتے جا رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس صورت حال کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سنجیدہ تجزیہ کیا جائے اور ان اسباب و عوامل کا سراغ لگایا جائے جو ملکی

سیاست میں مذہبی جماعتوں کی ناکامی کا باعث بنے ہیں۔ تاکہ ان کی روشنی میں دینی سیاسی جماعتیں اپنے مستقبل کو حال سے بہتر بنانے کی منصوبہ بندی کر سکیں۔

جہاں تک قومی سیاست میں حصہ لینے اور مروجہ سیاسی عمل کے ذریعے ملکی نظام کی تبدیلی اور نفاذ اسلام کی جدوجہد کا تعلق ہے اس میں کلام نہیں ہے کہ تمام تر خدشات و خطرات کے باوجود آج بھی دینی جماعتوں کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے، کیونکہ دینی حلقوں کا واحد ہدف نظام کی تبدیلی ہے۔ وہ موجودہ اجتماعی نظام کو غیر اسلامی سمجھتے ہیں جو یقیناً غیر اسلامی ہے اور دینی حلقے اس نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ اسلام کا عادلانہ نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ نظام کی تبدیلی کے دو ہی طریقے ہیں، ایک یہ کہ طاقت کے بل پر موجودہ نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا جائے اور دوسرا یہ کہ رائے عامہ کو ساتھ ملا کر اس کے ذریعے نظام کی تبدیلی کے عمل کو آگے بڑھایا جائے۔ طاقت اگر موجود ہو اور کافرانہ نظام کا تحفظ کرنے والی طاقتوں سے نظام کی باگ دوڑ چھین لینے کی سکت رکھتی ہو تو نظام کی تبدیلی کا یہ راستہ سب سے زیادہ موثر اور محفوظ ہے بلکہ شرعی اصولوں کی روشنی میں ایسی صورت حال میں طاقت کا استعمال دینی فریضہ کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ لیکن موجودہ حالات میں ایسی طاقت دینی قوتوں کے پاس موجود ہے نہ مستقبل قریب میں فراہم ہونے کے امکانات ہیں، اس لیے متبادل اور محفوظ راستہ میسر آنے تک پاکستان کے دینی حلقوں کے پاس صرف یہی ایک طریقہ باقی رہ جاتا ہے کہ وہ مروجہ سیاسی عمل کے ذریعہ ملکی نظام کی تبدیلی کی جدوجہد کرتی رہیں۔ البتہ قومی سیاست میں حصہ لینے والی دینی جماعتوں کو ان عوامل کا ضرور تجزیہ کرنا چاہیے جو اب تک سیاست میں ان کی ناکامی یا کمزوری کا باعث بنے ہوئے ہیں اور اسی ضمن میں بحث و تمحیص کے آغاز کے لیے چند گزارشات پیش کی جا رہی ہیں۔

نفاذ اسلام کے لیے ہوم ورک کی کمی

ہمارے خیال میں دینی سیاسی جماعتوں کی ناکامی کی ایک وجہ یہ ہے کہ نفاذ اسلام کے لیے ان کا ہوم ورک نہیں ۔ کیونکہ ان کے بیشتر کارکنوں بلکہ رہنماؤں کو بھی نفاذ اسلام کے فکری اور عملی تقاضوں کا ادراک نہیں ہے اور نہ ہی ان نظریاتی او رواقعاتی رکاوٹوں سے آگاہی ہے جو نفاذ اسلام کی راہ روکے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں جماعت اسلامی کے سوا کسی اور جماعت کے پاس رہنماؤں اور کارکنوں کی فکری، علمی اور عملی تربیت کا سرے سے کوئی نظام ہی موجود نہیں ہے، جبکہ جماعت اسلامی کے تربیتی نظام کی بنیاد بھی اجتماعی فکر کی بجائے شخصی فکر پر ہے جس سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہو رہے اور نہ ہی وہ شخصی فکر دینی حلقوں کا اعتماد حاصل کر سکی ہے۔

وقتی سیاسی فوائد کا حصول

دوسری وجہ یہ ہے کہ دینی سیاسی جماعتوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ملک کی دو بڑی سیاسی قوتیں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ نفاذ اسلام کے معاملہ میں یکساں سوچ اور طرز عمل کی حامل ہیں، صرف سیٹوں کے حصول، اخبارات کی کوریج، اور سیاسی اہمیت میں وقتی اضافے کی خاطر انہی میں سے کسی کے ساتھ سیاسی وابستگی کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ کوئی مذہبی جماعت پیپلز پارٹی کے ساتھ تمام تر طعنوں کو سہتے ہوئے بھی وقتی مفاد کی خاطر جا بیٹھتی ہے اور کوئی جماعت مسلم لیگ سے بارہا ڈسے جانے کے باوجود اسی بل میں پھر گھس جانے میں عافیت سمجھتی ہے۔ اس طرز عمل نے دینی سیاسی جماعتوں کے تشخص اور وقار کو جس بری طرح پامال کیا ہے اس کے

تصور سے بھی باشعور دینی کارکنوں کو جھرجھری آجاتی ہے لیکن راہنمایان گرامی منزلت اس قدر احساس پروف واقع ہوئے ہیں کہ ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

دینی جماعتوں کے مابین اتحاد کی کمی

تیسری وجہ یہ ہے کہ مذہبی جماعتوں نے ابھی تک آپس میں مل بیٹھنے اور دینی حلقوں کے باہمی اتحاد کی ضرورت وافادیت کو محسوس نہیں کیا۔ جب کبھی عوامی دباؤ سے بے بس ہو کر وقتی طور پر مل بیٹھتے ہیں تو الیکشن میں بڑے سیاسی اتحادوں کی طرف سے سیٹوں کی سبز جھنڈی بلند ہوتے ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ادھر کو لپک پڑتے ہیں جبکہ ملتا وہاں سے بھی کچھ نہیں ہے۔ دینی سیاسی جماعتوں کے قائدین آج تک اس حقیقت کا ادراک ہی نہیں کر سکے کہ ان کی اصل قوت ان کے باہمی اتحاد میں ہے اور ان کے متحد ہونے کی صورت میں عوام نے انہیں کبھی مایوس نہیں کیا۔ پاکستان کے قیام کے بعد ملک کی دینی جماعتوں نے حقیقی سیاسی اتحاد کا مظاہرہ ایک مرتبہ 1977ء میں کیا ہے اور اس کے ثمرات آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ انہی ثمرات کی وجہ سے ملک کی حقیقی حکمران قوتوں نے ہمیشہ کے لیے یہ حکمت عملی طے کر لی ہے کہ پاکستان کے دینی حلقوں اور جماعتوں کو کبھی کسی عملی اور حقیقی سیاسی اتحاد کی منزل تک پہنچنے نہ دیا جائے۔

فرقہ وارانہ تشخص اور ترجیحات

دینی سیاسی جماعتوں کی قومی سیاست میں ناکامی کی ایک وجہ ان کا فرقہ وارانہ تشخص اور ترجیحات بھی ہیں۔ ملک کی کوئی دینی سیاسی جماعت ایسی نہیں ہے جو صرف ایک ہی مذہبی مکتبۂ فکر کی نمائندگی نہ کرتی ہو۔ جماعت اسلامی نے اس دائرہ سے نکل کر ہمہ گیر ہونے کا تصور دیا لیکن طریق کار ایسا اختیار کیا کہ عملاً ملک میں پہلے موجود مذہبی مکاتب فکر میں ایک نئے نیم مکتبۂ فکر کا عنوان بن گئی۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ ہماری دینی سیاسی جماعتوں کی تشکیل مذہبی مکاتب فکر کی بنیاد پر ہے اور ان کے ہاں کارکنوں کی تربیت، قیادت کے چناؤ، اور پالیسیوں کے تعین کا دارومدار بھی فرقہ وارانہ ترجیحات پر ہے۔ پھر بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ہمارے دینی تعلیمی اداروں میں کارکنوں کی تربیت کے لیے دوسرے مذہبی مکاتب فکر کے خلاف ان کی ذہن سازی کا جو معیار قائم کر دیا گیا ہے، لادین اور سیکولر لابیوں کے خلاف ان کی ذہن سازی اس کا دسواں حصہ بھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ دینی سیاسی جماعتوں کے کارکن سیکولر اور منافق سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل بیٹھنا تو اس قدر معیوب نہیں سمجھتے لیکن آپس میں دوسرے مذہبی مکاتب فکر کے کارکنوں کے ساتھ مل بیٹھنے میں ان کا حجاب بدستور قائم رہتا ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جمعیۃ علماء اسلام، جمعیۃ العلمائے پاکستان، جمعیۃ اہل حدیث، جماعت اسلامی اور دیگر دینی سیاسی جماعتوں کے قائدین کو انفرادی طور پر اور باہمی مل بیٹھ کر ان اسباب و عوامل کا ضرور جائزہ لینا چاہیے اور ان منفی عوامل سے گلو خلاصی کے لیے ٹھوس حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے۔ ہماری رائے آج بھی یہی ہے کہ ملک کی دینی سیاسی جماعتوں کے سامنے ملکی نظام کو تبدیل کرنے اور نفاذ اسلام کے لیے مروجہ سیاسی عمل کے ذریعے جدوجہد ہی موجودہ

حالات میں واحد راستہ ہے۔ اور اگر وہ باہمی منافرت، بے اعتمادی اور فرقہ وارانہ ترجیحات پر قابو پا کر آپس میں حقیقی سیاسی اتحاد کی کوئی مستحکم بنیاد قائم کر سکیں تو نہ صرف مروجہ سیاست کی خرابیوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں بلکہ اسے دینی تقاضوں کے سانچے میں ڈھالنے کی سکت بھی ان میں موجود ہے۔

مجلہ / مقام / زیر اہتمام:

روزنامہ نوائے وقت، لاہور

تاریخ اشاعت:

۱۵ جنوری ۱۹۹۲ء

مغربی فلسفہ کی یلغار اور دینی صحافت کی ذمہ داریاں

(19 و 20 اپریل 1994ء کو مارگلہ موٹل اسلام آباد میں دعوہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی طرف سے ''اکیسویں صدی کا چیلنج اور دینی صحافت'' کے عنوان سے دو روزہ سیمینار منعقد ہوا جس میں مختلف مذہبی مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے سرکردہ مدیران جرائد نے شرکت کی۔ 19 اپریل کو سیمینار کے دوسرے اجلاس میں مولانا زاہد الراشدی نے مندرجہ ذیل مقالہ پیش کیا۔ اس نشست کی صدارت ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈائریکٹر محترم ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے کی۔)

مغرب کا مادی فلسفہ حیات جو سولائزیشن، انسانی حقوق، جمہوریت اور آزادی کے پر فریب نعروں کے ساتھ آج دنیا کے ایک بڑے حصے پر اپنی بالادستی کا پرچم اٹھائے ہوئے ہے، انسانی

معاشرہ کے لیے کوئی نیا فلسفہ نہیں ہے بلکہ نسل انسانی کے آغاز سے چلے آنے والے اسی فلسفہ حیات کی ترقی یافتہ شکل ہے جسے قرآن کریم نے **ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس** سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ فلسفہ جو وحی الٰہی اور علم یقینی کے بجائے انسانی خواہشات و مفادات اور عقل و شعور کے حوالے سے نسل انسانی کی راہ نمائی کا دعوے دار ہے۔

انسانی معاشرہ میں آج تک جتنے قوانین، ضابطوں اور اصولوں کی حکمرانی رہی ہے وہ بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہیں۔

1- ایک حصہ ان اصولوں اور قوانین و ضوابط پر مشتمل ہے جن کی تشکیل خود انسانی ذہن کی ہے۔ شخصی آمریت، بادشاہت، طبقاتی حکمرانی اور جماعتی ڈکٹیٹر شپ کے مراحل سے گزرتے ہوئے انسانی ذہن آج سولائزیشن اور جمہوریت کے نام سے ارتقا کی آخری منزل سے ہمکنار ہو چکا ہے۔

2- دوسرا حصہ اس نظام حیات کے تدریجی مراحل سے عبارت ہے جس کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے اور جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر مختلف مراحل طے کرتا ہوا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی پر مکمل ہوگیا ہے۔ جبکہ خاتم النبیین حضرت محمدؐ کا پیش کردہ نظام حیات قرآن و سنت اور خلافت راشدہ کی صورت میں موجود ہے۔

مغرب کا دانشور دنیا کو یہ نوید دے رہا ہے کہ انسانی معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لیے انسانی ذہن جو کچھ سوچ سکتا تھا وہ سوچ چکا ہے اور اس کی کاوشوں کی معراج آج کے مغربی معاشرہ کی شکل میں دنیا کے سامنے ہے، اب اس سے آگے بڑھنا انسانی ذہن کے بس میں نہیں ہے، اس لیے اس سے بہتر کسی نظام حیات کی توقع انسانی ذہن سے نہیں کرنی چاہیے۔ مغربی دانشور کا یہ کہنا بالکل درست ہے لیکن درست ہونے کے باوجود نامکمل ہے اس لیے کہ مغربی دانشور کے

سامنے صرف انسانی ذہن کی کاوشیں ہیں اور وحی الٰہی کے تدریجی مراحل یا تو اس کی نظروں سے اوجھل ہیں یا اس نے جان بوجھ کر اس حقیقت سے گریز اختیار کر رکھا ہے۔ جبکہ حالات کی اصل تصویر یوں ہے کہ ایک طرف انسانی ذہن کے تشکیل کردہ نظام ہائے حیات ہیں جن کی آخری اور ترقی یافتہ شکل مغربی فلسفہ و تہذیب کی صورت میں دنیا کے ایک بڑے حصے پر تسلط جمائے ہوئے ہے، اور دوسری طرف وحی الٰہی کا پیش کردہ نظام حیات ہے جس کا مکمل نمونہ خلافت راشدہ کی صورت میں انسانی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش حصہ ہے۔ اب یہ دونوں نظام ہائے حیات اپنی کشمکش کے ایک فیصلہ کن دور میں داخل ہونے والے ہیں جس کی تیاریوں اور ریہرسل کے مناظر اس وقت بھی دنیا کے مختلف حصوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

مغرب کا فلسفہ حیات اس فکر میں ہے کہ اس نے گزشتہ دو صدیوں کے دوران انسانی معاشرہ پر جو تسلط قائم کیا ہے وہ کمزور نہ ہونے پائے بلکہ اس کے دائرے میں وسعت پیدا ہو۔ جبکہ وحی الٰہی کی بنیاد پر تشکیل پانے والا نظام حیات دنیا بھر کے اہل دین کی خواہشات اور آرزوؤں کی گہرائیوں سے ابھر کر سطح ارض پر جلوہ نمائی کے لیے بے تاب ہے اور کھلی آنکھیں رکھنے والے دور افق پر طلوع سحر کے آثار دیکھ رہے ہیں۔

مغربی فلسفہ حیات جو خود کو سیکولرزم، جمہوریت، سولائزیشن، آزادی اور انسانی حقوق کے دلکش لیبلز سے مزین کیے ہوئے ہے انسانی زندگی کے ساتھ وحی الٰہی کے ایسے تعلق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے جو انسانی معاشرہ کے کسی بھی اجتماعی دائرہ کے لیے حدود کار کا تعین کرتا ہو۔ اور وہ زندگی کے اجتماعی امور کے حوالہ سے انسانی عقل ہی کو آخری اور فیصلہ کن اتھارٹی قرار دے کر اجتماعی عقل کی خدائی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ یہ فلسفہ دراصل اس یورپ کا فلسفہ ہے جس نے کلیسا، بادشاہت اور جاگیرداری کے مشترکہ مظالم کی چکی میں صدیوں تک پستے رہنے

کے بعد اس گٹھ جوڑ کے خلاف بغاوت کی اور بادشاہت اور جاگیرداری کے حق میں کلیسا اور پادریوں کے جانبدارانہ و ظالمانہ کردار سے متنفر و دلبرداشتہ ہو کر رد عمل کے طور پر مذہب اور وحی الٰہی کی رہنمائی سے ہی انکار کر بیٹھا۔

آج دنیا کے پانچ آباد براعظموں میں سے تین یعنی امریکہ، یورپ اور آسٹریلیا پر اس فلسفہ کی حکمرانی ہے۔ جبکہ ایشیا اور افریقہ میں تسلط قائم کرنے کے لیے اس کے پیروکار مسلسل ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اس کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ یورپ کے باشندوں نے کولمبس اور واسکوڈی گاما کی صورت میں دنیا کے دوسرے براعظموں میں آباد اور داخل ہونے کے لیے جس مہم کا آغاز کیا تھا اس کے نتیجہ میں امریکہ اور آسٹریلیا میں یورپی آبادکار مقامی آبادیوں کو پیچھے دھکیل کر اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ آج ان دو براعظموں پر یورپی آبادکار ہی حکمران ہیں جبکہ اصل اور قدیمی آبادی کا ان ممالک کے اجتماعی نظام کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں ہے۔ مگر افریقہ اور ایشیا نے یورپی آبادکاروں کو واپس جانے پر مجبور کر دیا جس کی وجہ سے یورپین حکمرانوں کو ان براعظموں میں اپنے مفادات کی حفاظت اور یورپی فلسفہ کی حکمرانی کے لیے ایک درمیانی نسل جنم دینا پڑی جو افریقہ اور ایشیا کے ممالک پر اس وقت حکمران ہے اور مغربی آقاؤں کی خواہشات و ہدایات اور اپنے ممالک کے عوام کے مفادات و نظریات کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ گئی ہے۔ آج ہمارا اصل المیہ یہی حکمران طبقے ہیں جو جسمانی اعتبار سے ایشیائی اور افریقی ہیں مگر ذہن، سوچ اور تربیت کے لحاظ سے یورپین ہیں۔ ان حکمرانوں کے ذریعے سے افریقہ اور ایشیا کے عوام سے یورپین آبادکاروں کو قبول نہ کرنے کا انتقام لیا جا رہا ہے۔

عالمی تناظر سے ہٹ کر وطن عزیز اسلامی جمہوریہ پاکستان کے حوالہ سے اس کشمکش کا جائزہ لیا جائے تو واقعات کی ترتیب کچھ یوں بنتی ہے کہ برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش پر برطانوی تسلط کے

خلاف جنگ آزادی میں مسلمانوں نے فیصلہ کن کردار ادا کیا اور جنگ آزادی کے آخری مراحل میں اسلامی فلسفہ حیات کی حکمرانی کے لیے پاکستان کے نام سے الگ ملک کا مطالبہ کر کے تقسیم ہند کی راہ ہموار کی، اس طرح دنیا کے نقشہ پر پاکستان کا وجود نمودار ہوگیا۔ لیکن پاکستان کے قیام کے بعد اس وطن عزیز میں اسلامی فلسفہ حیات کی حکمرانی قائم کرنے کے بجائے مغربی فلسفہ کو ہی منزل قرار دے لیا گیا اور ملک میں مغربی جمہوریت اور سولائزیشن کی حکمرانی یا قرآن و سنت کی بالادستی کے لیے ایک طویل کشکش کا آغاز ہوگیا۔ اس کشمکش میں ایک طرف برطانوی حکمرانوں کی پیدا کردہ حکمرانوں کی دوغلی نسل ہے جو اپنی ہی طرح کا نظام پاکستان پر مسلط رکھنا چاہتی ہے اور اس کی پشت پر پورا مغرب اپنے تمام تر وسائل اور توانائیوں کے ساتھ کھڑا ہے۔ جبکہ دوسری طرف وہ نظریاتی حلقے اور کارکن ہیں جو جنگ آزادی اور قیام پاکستان کے اصل مقاصد کو نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ جمہوریت، سیکولرزم،
سولائزیشن، انسانی حقوق اور آزادی کے حوالہ سے پیش کیے جانے والے مغربی فلسفہ کو مسترد کرتے ہوئے قرآن و سنت کی غیر مشروط بالادستی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

مغربی فلسفہ آج ہمارے معاشرے میں کس حد تک دخیل ہے اور اس کے پیروکار اسلامی فلسفہ حیات کو اجتماعی نظام سے بے دخل کرنے کے لیے کن کن مورچوں سے ہم پر حملہ آور ہیں؟ اس کے عملی نقشہ پر ایک نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے، اس لیے واقعات کی ایک ترتیب پیش خدمت کی جا رہی ہے جس سے اس نقشہ کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

پاکستان کے دینی حلقوں کی جدوجہد کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کا اعلان کرنے والی قرارداد مقاصد، اسلام کو سرکاری مذہب قرار دینے کی دفعہ، اور تمام قوانین کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کی ضمانت دستور پاکستان میں شامل ہے۔ لیکن ان کے باوجود نوآبادیاتی نظام

ملک میں تسلسل کے ساتھ موجود ہے اور اسے نہ صرف آئینی تحفظ حاصل ہے بلکہ جب بھی اس نظام کے کسی بنیادی حصہ کو اپنی جگہ سے ہلانے کی کوشش ہوتی ہے پورا اجتماعی نظام اس کی حفاظت کے لیے مستعد ہو جاتا ہے۔

1987ء میں امریکہ نے پاکستان کی فوجی و اقتصادی امداد کے لیے جو شرائط پیش کیں اور جن کے پورا نہ ہونے کے باعث یہ امداد بدستور بند چلی آرہی ہے، ان میں ایٹمی پروگرام ختم کرنے اور منشیات کو کنٹرول کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کے منافی قوانین نافذ نہ کرنے، اقلیتوں کے بارے میں امتیازی قوانین ختم کرنے، اور قادیانیوں کے جداگانہ تشخص کے لیے کیے گئے اقدامات کو رول بیک کرنا بھی شامل ہے۔ انسانی حقوق کے منافی قوانین سے مراد مغرب کی نظر میں سنگسار کرنے، ہاتھ کاٹنے، کوڑے لگانے اور مجرم کو کھلے بندوں سزا دینے کے قرآنی احکام ہیں جس کی قانونی تشریح کی ایک جھلک ہم پاکستان کی عدالت عظمیٰ میں گزشتہ دو سال کے دوران ہونے والی اس بحث کے حوالہ سے دیکھ چکے ہیں کہ مجرم کو کھلے بندوں سزا دینا انسانی حقوق کے منافی ہے۔ اسی طرح اقلیتوں کے بارے میں امتیازی قوانین سے مراد جداگانہ الیکشن کا قانون ہے جسے ختم کرانے کے لیے مغربی لابیاں اس وقت اپنا پورا زور صرف کر رہی ہیں۔

قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دینے کے لیے ''شریعت بل'' کے عنوان سے ملک گیر تحریک چلی۔ اس کے لیے تمام مکاتب فکر نے مشترکہ مہم کا اہتمام کیا، سینٹ آف پاکستان نے ایک مرحلہ پر اسے منظور بھی کر لیا لیکن قومی اسمبلی میں منظوری کے فیصلہ کن مرحلہ میں اس کا کیا حشر ہوا؟ یہ اسلامائزیشن کی تاریخ کا ایک دلخراش باب ہے۔ قرآن و سنت کی بالادستی کو سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچے کے متاثر نہ ہونے کی شرط کے ساتھ مشروط کر کے مغربی فلسفہ کی جے (بالادستی) کا اعلان کر دیا گیا۔ اور پاکستان میں متعین امریکی سفیر نے اس پر کھلے بندوں

اطمینان کا اظہار کر کے ان زیر زمین کہانیوں پر مہر تصدیق ثبت کر دی جو شریعت بل کو سبوتاژ کرنے کے حوالہ سے امریکی سفارت خانہ کی درون خانہ سرگرمیوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔

قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک نئی امت کی حیثیت دے کر ان کے جداگانہ تشخص کے تعین کے لیے کیے گئے آئینی و قانونی اقدامات پر مغربی لابیوں نے انسانی حقوق کے نام سے الگ شور مچا رکھا ہے۔ اور جنیوا میں انسانی حقوق کمیشن کی طرف سے ان اقدامات کو قادیانیوں کے انسانی حقوق کے منافی قرار دینے کے علاوہ یہ مسئلہ امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی کے ایجنڈے پر اس وقت بھی موجود ہے۔

شناختی کارڈ میں مذہب کے خانہ کا اضافہ دستور پاکستان کے بعض بنیادی فیصلوں کا ناگزیر تقاضہ ہے لیکن مغرب کے مسلسل دباؤ نے اس کا راستہ روک رکھا ہے۔

وفاقی شرعی عدالت نے سود سے تعلق رکھنے والے قوانین کو غیر شرعی قرار دے کر ان کے خاتمہ کے لیے وفاق پاکستان کو ایک متعین وقت دے دیا مگر یہ مغربی ممالک اور لابیوں اور ذرائع ابلاغ کا مسلسل پراپیگنڈا اور دباؤ ہی تھا جس نے حکومت پاکستان کو اس فیصلہ پر عملدرآمد سے روکا اور اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرنے پر مجبور کر دیا۔

گستاخی رسولؐ دنیا کے ہر مذہب میں ناقابل معافی جرم ہے۔ خود بائبل میں مذہبی پیشوا کی توہین پر موت کی سزا کا حکم ہے اور اسلام بھی گستاخ رسولؐ کے لیے موت کی سزا کا قانون پیش کرتا ہے۔ لیکن جب سے پاکستان میں یہ قانون نافذ ہوا ہے مغربی ذرائع ابلاغ اور لابیاں اس کے خلاف مسلسل حرکت میں ہیں اور اسے انسانی حقوق کے منافی قرار دے کر ختم کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ ابھی حال ہی میں مسئلہ کشمیر کے حوالہ سے مغربی ممالک کا دورہ کرنے والے پاکستانی راہ نماؤں کے وفد کو انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل نے تحریری

طور پر جو مطالبات دیے ہیں ان میں آٹھویں آئینی ترمیم، جداگانہ انتخاب اور گستاخ رسولؐ کے لیے موت کی سزا کے قانون کا خاتمہ شامل ہے۔ بلکہ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ان شرائط و مطالبات کو مسئلہ کشمیر کے ساتھ منسلک کر کے اس سلسلہ میں اپنے دباؤ کی شدت اور سنگینی میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے۔

آٹھویں آئینی ترمیم کا خاتمہ مغربی لابیوں کی محنت کا ایک مستقل موضوع ہے جس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ یہ آئینی ترمیم وفاقی شرعی عدالت، جداگانہ الیکشن کے قانون، امتناع قادیانیت آرڈیننس، حدود آرڈیننس، اور دیگر اسلامی قوانین کو دستوری تحفظ فراہم کرتی ہے۔ اس ترمیم کے خاتمہ سے ان تمام امور کے خاتمہ کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

ذمہ دار حلقوں کا یہ انکشاف بھی صورتحال کی سنگینی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ چند سال قبل ملک میں شروع کی جانے والی مسجد مکتب اسکیم کا تعلیمی پروگرام بھی امریکی دباؤ کے تحت ختم کیا گیا تھا اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ اس طرح نئی نسل مولوی کے زیر اثر آکر بنیاد پرست ہو جائے گی۔

یہ ہے اس مسلسل اور مربوط محنت کی ایک جھلک جو ہمارے معاشرہ پر مغربی فلسفہ کی گرفت کو قائم رکھنے اور مستحکم کرنے کے لیے ایک عرصہ سے جاری ہے۔ اس محنت کے پیچھے امریکہ ہے، پورا مغرب ہے، بین الاقوامی ذرائع ابلاغ ہیں، انسانی حقوق کے نام پر کام کرنے والی بین الاقوامی تنظیمیں ہیں، پاکستان میں نوآبادیاتی نظام کے محافظ طبقے ہیں، اسلامی نظام کے نفاذ سے اپنے مفادات کو خطرہ محسوس کرنے والے طاقتور گروہ ہیں، اور قومی زندگی کے مختلف اجتماعی شعبوں میں اہم حیثیت رکھنے والے افراد ہیں۔ ان سب کی مشترکہ تگ و دو کے اس نتیجہ کو ایک واقعی حقیقت کے طور پر قبول کرنے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہے کہ

دینی حلقے جو 1947ء کے بعد سے 1984ء تک اسلامائزیشن کے محاذ پر سست رفتار سہی مگر کچھ نہ کچھ پیش رفت کرتے دکھائی دے رہے تھے اب دفاعی پوزیشن پر آگئے ہیں۔ اور اس دفاعی لائن کے پیچھے بھی ان کی صفوں میں اشتراک و اتحاد نہیں ہے، ترتیب نہیں ہے، منصوبہ بندی نہیں ہے، مسائل کے ادراک و تجزیہ کا ذوق نہیں ہے اور ترجیحات کو درست کرنے کا احساس نہیں ہے۔

معافی کا خواستگار ہوں کہ اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے عالم اسلام اور پاکستان میں اسلامی نظام حیات اور مغربی فلسفہ کی کشمکش کا تعارف قدرے تفصیل کے ساتھ آپ حضرات کے سامنے لانا پڑا۔ لیکن جب مغربی فلسفہ کی یلغار کے حوالہ سے دینی صحافت کی ذمہ داریوں پر بحث مقصود ہے تو اس یلغار کے مالہ و ماعلیہ پر ایک نظر ڈال لینا ضروری تھا۔ اس پس منظر میں دینی صحافت کی سب سے اہم اور بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ

اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش کے عالمی تناظر میں دنیا کے واقعات، حقائق، مسائل اور مشکلات کو سامنے لائے اور اپنے قارئین کو ان سے آگاہ کرے۔

اسلام کے خلاف کام کرنے والی لابیوں اور تنظیموں کی نشاندہی کرے اور ان کے طریق واردات کو بے نقاب کرے۔

انسانی حقوق کے حوالہ سے اسلامی احکام و قوانین پر کیے جانے والے اعتراضات و شبہات کا جائزہ لے کر علمی و تحقیقی انداز میں ان کا جواب دے۔

مغربی تہذیب و فلسفہ نے انسانی معاشرہ کو جن پریشانیوں، مشکلات اور مسائل سے دوچار کر رکھا ہے، تجزیہ و تحقیق کے حوالہ سے ان کو سامنے لائے اور پورے اعتماد و حوصلہ کے ساتھ ان خرابیوں کو اجاگر کر کے رائے عامہ کو ان سے روشناس کرائے۔

دینی حلقوں کے انتشار کو کم کرنے اور باہمی مشاورت و اشتراک عمل کو فروغ دینے کی کوشش کرے۔

اپنے محدود دائرہ پر قناعت کرنے کے بجائے اسے وسعت دینے کا اہتمام کرے اور ان مقامات تک موثر رسائی کی راہ نکالے جو مغربی فلسفہ کی اس یلغار کو روکنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

علماء کرام، خطباء، مبلغین اور دینی کارکنوں کی غالب اکثریت جو دینی مدارس میں فکری تربیت اور ذہن سازی کے فقدان کے باعث مذکورہ فکری و نظریاتی کشمکش اور اس کے تقاضوں سے بے خبر ہے، اس کی ذہن سازی اور فکری راہنمائی و تربیت کو اپنی ترجیحات میں بنیادی اہمیت دے۔

یہ سارے وہ کام ہیں جو موجودہ حالات میں دینی صحافت کی ذمہ داریوں کے ضمن میں آتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ دینی صحافت کا موجودہ ڈھانچہ اپنی ہیئت اور ترجیحات کے حوالہ سے ان امور کو اہمیت نہیں دے پارہا جس کی ضرورت ہے۔ اس امر کی مزید وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ دینی صحافت کے موجودہ دائرہ کار پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ ہمارے ملک میں شائع ہونے والے دینی جرائد کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1- بعض جرائد مختلف دینی جماعتوں کے آرگن کے طور پر شائع ہوتے ہیں۔

2- بعض جرائد اسلام کے حوالہ سے کام کرنے والی بعض شخصیات کے ترجمان ہیں۔

3- بعض جرائد علمی اداروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

4- اور بعض جرائد وہ ہیں جو مسالک اور مکاتب فکر کے حوالہ سے خدمات سر انجام دیتے ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ ان کی ترجیحات بھی اپنے اپنے مقاصد کے حوالہ سے یقیناً مختلف ہیں۔ ایسے جرائد جو جماعت، شخصیت، ادارہ اور مسلک کی ترجیحات کے دائروں سے بے نیاز ہو کر عالم

اسلام کی مشکلات و مسائل، مغربی فلسفہ کی یلغار، اسلامائزیشن کے تقاضوں اور سیکولر لابیوں کی سرگرمیوں کی بنیاد پر اپی ترجیحات کا آزادانہ تعین کر سکیں، ہمارے معاشرہ میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اور جو چند ایک ہیں خود ہمارے دینی حلقوں کا رویہ ان کے ساتھ حوصلہ افزائی کا نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دینی جرائد جن دائروں میں کام کر رہے ہیں وہ خدانخواستہ غیر ضروری ہیں۔ ہرگز نہیں بلکہ ان میں سے ہر کام کی ضرورت اپنے دائرہ میں مسلم ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا البتہ ترجیحات کا معاملہ مختلف ہے۔ اور میں بصد احترام یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلام اور اسلامی تحریکات کے حوالہ سے مغربی فلسفہ اور لابیوں کی ہمہ جہت یلغار کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے دینی جرائد کی موجودہ ترجیحات مجموعی طور پر درست نہیں ہیں اور ہمیں ان پر بہرحال نظرثانی کرنی چاہیے۔

میں نے جب محترم ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب، ڈائریکٹر دعوہ اکیڈمی کی خدمت میں دینی جرائد کے مدیران کے اس سیمینار کے انعقاد کی تجویز پیش کی تھی تو میرے پیش نظر یہی بات تھی کہ ہمیں اپنی ترجیحات اور طریق کار پر باہمی مشاورت کے ساتھ نظرثانی کرنی چاہیے اور کھلے دل و دماغ کے ساتھ ان امور کا جائزہ لینا چاہیے کہ عالم اسلام اور پاکستان کے حوالہ سے دینی صحافت سے ایک باشعور مسلمان کی توقعات کیا ہو سکتی ہیں؟ وہ توقعات اور ضروریات ہم کہاں تک پوری کر رہے ہیں؟ اس راستہ کی مشکلات اور رکاوٹیں کیا ہیں؟ اور ضروریات اور کام کے درمیان جو خلا دکھائی دے رہا ہے اس کو پر کرنے کے لیے ہم کیا کچھ کر سکتے ہیں؟ میں ڈاکٹر غازی صاحب اور ان کے رفقاء کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری اس تجویز کو قبول کیا اور اس سیمینار کا اہتمام کر کے دینی جرائد کے باہمی رابطہ و ملاقات کے کار خیر کا آغاز کر دیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں

جزائے خیر دیں اور ان کی اس کاوش کو قبولیت سے نوازتے ہوئے مثبت ثمرات سے بہرہ ور فرمائیں۔

اس موقع پر میں اپنی تجویز کا دوسرا حصہ سیمینار کے معزز شرکاء کی خدمت میں پیش کرنا مناسب سمجھوں گا جو دعوۃ اکیڈمی کے لیے نہیں بلکہ شرکائے سیمینار کے لیے ہے کہ مشاورت کو مستقل شکل دینے کی کوئی عملی صورت نکالنی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم مختلف مقامات پر سال میں دو تین دفعہ جمع ہو کر مسائل اور ضروریات کا جائزہ لے لیا کریں تو باہمی مشاورت اور رابطہ کی برکت سے ہمارے کام کی ترجیحات اور تربیت کو خود بخود صحیح سمت مل جائے گی اور ہم اپنے موجودہ کام کی افادیت میں کئی گنا اضافہ کر سکیں گے۔

اس مقصد کے لیے اگر کوئی ہلکی پھلکی سی سوسائٹی تشکیل دے لی جائے تو مناسب رہے گا۔

سوسائٹی سے میری مراد ٹریڈ یونین طرز کی کوئی ایسی تنظیم نہیں ہے جو حقوق و مفادات اور مراعات کی دوڑ میں معاصر تنظیموں کے ساتھ شریک ہو۔ بلکہ خالصتاً علمی و فکری قسم کی سوسائٹی کا قیام مقصود ہے جو دینی جرائد کے درمیان مفاہمت اور اشتراک کی فضا پیدا کرے، ایک اسٹڈی سرکل کے طور پر پیش آمدہ مسائل کا تجزیہ کر کے دینی جرائد سے وابستہ افراد کی بریفنگ اور راہنمائی کا فریضہ سر انجام دے اور باصلاحیت نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کر کے دینی صحافت میں اچھا لکھنے والے افراد کا اضافہ کرے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ شرکائے سیمینار طویل سمع خراشی پر معذرت قبول کرتے ہوئے میری گزارشات اور تجویز کو سنجیدہ توجہ سے نوازیں گے۔

محترم ڈاکٹر محمود احمد غازی، محترم محمد افتخار کھوکر، اور الدعوۃ اکیڈمی کے دیگر رفقاء کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتے ہوئے اس دعا کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں کہ اللہ رب العزت ہمیں اخلاص

نیت کے ساتھ توفیق عمل عطا کریں اور اسلام و عالم اسلام کو درپیش مسائل و مشکلات میں امت مسلمہ کو صحیح سمت راہنمائی کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

مجلہ / مقام / زیراہتمام:

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

تاریخ اشاعت: مئی ۱۹۹۴ء

جنرل پرویز مشرف سے دینی جماعتوں کی توقعات

افغانستان میں جہادی ٹریننگ کے مراکز، طالبان کی اسلامی حکومت، پاکستان کے دینی مدارس اور دہشت گردی کی وارداتوں کے حوالے سے میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف کی پریس کانفرنسوں کے بعد ملک کے دینی حلقوں میں یہ خدشات بڑھتے جا رہے تھے کہ حکومت، طالبان کے ساتھ ساتھ پاکستان کے دینی مراکز و مدارس کے خلاف بھی کسی کارروائی کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس پس منظر میں مجلس عمل علماء اسلام پاکستان نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں ''علماء کنونشن'' منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اس صورتحال میں حکومتی اقدامات اور عزائم سے نمٹنے کے لیے کوئی لائحہ عمل طے کیا جا سکے۔ مجلس عمل علماء اسلام پاکستان دینی جماعتوں کا متحدہ محاذ ہے جس میں دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والی کم و بیش سب دینی و سیاسی جماعتیں شامل ہیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر اس متحدہ محاذ کے سربراہ ہیں جبکہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے فرزند مولانا سید عطاء المومن شاہ بخاری رابطہ سیکرٹری کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

علماء کنونشن کے لیے بذریعہ ڈاک ارسال کیے جانے والے دعوت نامے پوسٹ کیے جا چکے تھے اور گوجرانوالہ اور قریبی شہروں میں علماء کرام سے رابطوں کے لیے پروگرام ترتیب دیا جا رہا تھا کہ میاں محمد نواز شریف کی حکومت برطرف کر دی گئی اور بری فوج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف نے اقتدار سنبھال لیا۔ اس کے بعد ایک دو روز اسی انتظار میں گزر گئے کہ نئی صورتحال میں کنونشن کے انعقاد کی گنجائش اور ضرورت ہوگی یا نہیں۔ مگر صورتحال واضح نہ ہونے پر مجلس عمل کی قیادت نے فیصلہ کیا کہ علماء کنونشن کا باقاعدہ انعقاد سردست نہ کیا جائے، اس سلسلہ میں مزید رابطے کیے جائیں، باقی ماندہ دعوت نامے روک لیے جائیں اور جو حضرات فون پر رابطہ کریں انہیں کنونشن کے التواء کی اطلاع کر دی جائے۔ تاہم جن لوگوں کو دعوت نامے بذریعہ ڈاک بھجوائے جا چکے ہیں، چونکہ انہیں دوبارہ خط ارسال کرنے کا وقت نہیں رہا اس لیے ان میں سے جو دوست آجائیں ان کے ساتھ تازہ ترین صورتحال پر غیر رسمی مشاورت کر لی جائے۔

چنانچہ اس پس منظر میں ۱۶ اکتوبر کو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں مجلس عمل میں شامل جماعتوں کے چند سرکردہ علماء کرام جمع ہوئے اور ڈیڑھ دو گھنٹے کی غیر رسمی مشاورت میں انہوں نے ملک کی تازہ ترین صورتحال کا جائزہ لیا۔ شرکاء میں مولانا سید عطاء المومن شاہ بخاری کے علاوہ جمعیۃ علماء اسلام (ف) کے مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی اور مولانا سید عبد المالک شاہ، جمعیۃ علماء اسلام (س) کے مولانا عبد الرؤف فاروقی، علامہ محمد احمد لدھیانویؒ، مولانا محمد یحییٰ محسن اور ڈاکٹر غلام محمد، پاکستان شریعت کونسل کے مخدوم منظور احمد تونسوی اور مولانا قاری جمیل الرحمان اختر، مجلس تحفظ ختم نبوت کے مولانا قاری محمد یوسف عثمانی، مجلس احرار اسلام کے مولانا اللہ یار راشد، سپاہ صحابہ پاکستان کے قاری محمد یوسف قصوری اور میرپور آزاد کشمیر سے تشریف لانے والے مولانا مفتی محمد رویس خان، مولانا مفتی محمد یونس کشمیری اور

مولانا محمد اشفاق کے علاوہ بزرگ عالم دین مولانا احمد سعید ہزاروی اور راقم الحروف بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

شرکاء محفل نے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ پاک فوج میں خلفشار پیدا کرنے کی سازش ناکام ہوگئی ہے اور سابقہ حکومت نے واشنگٹن کے حکمرانوں کی آشیرباد سے طالبان کی اسلامی حکومت اور پاکستان کے دینی مدارس کے خلاف جس کارروائی کا عزم ظاہر کیا تھا اور جس کے لیے مدارس دینیہ کی فہرستیں اور کوائف مرتب ہونا شروع ہوگئے تھے وہ کارروائی وقتی طور پر رک گئی ہے۔ مگر ان دونوں حوالوں سے نئی حکومت کے عزائم کے بارے میں ابہام بدستور موجود ہیں اور جب تک نئے حکمرانوں کی پالیسی اور ترجیحات سامنے نہیں آتیں اس وقت تک اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے یہی مشورہ ہوا کہ چند روز تک صورتحال واضح ہونے پر ازسرنو ''علماء کنونشن'' بلایا جائے تاکہ دینی حلقوں کے آئندہ لائحہ عمل کا تعین کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی مشورہ میں یہ بات طے پائی کہ مجلس عمل کی طرف سے ایک ''یادداشت'' جنرل پرویز مشرف کو بھجوائی جائے جس میں ان توقعات اور خدشات کی طرف انہیں توجہ دلائی جائے جو ملک کی حالیہ تبدیلیوں کے بعد دینی حلقوں کے ذہنوں میں ابھر رہے ہیں اور جن سے ملک کی نئی حکومت کا آگاہ ہونا ضروری ہے۔

اس سلسلے میں شرکاء محفل نے جن امور کا تذکرہ کیا ان کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

1- اول یہ کہ آئین معطل ہوجانے کے بعد آئین کی اسلامی دفعات بالخصوص قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے والی دستوری ترمیم کے بارے میں ابہام پیدا ہوگیا ہے اور ان دفعات کا تعطل ان بین الاقوامی لابیوں کی تقویت کا باعث بن سکتا ہے جو پاکستان کے دستور سے اسلامی دفعات

کو حذف کرانے اور پاکستان کو سیکولر قرار دلوانے کے لیے مسلسل مصروف عمل ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ فوجی حکمران دستور پاکستان کی اسلامی دفعات بالخصوص قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی آئینی دفعہ کے بارے میں اپنے موقف کا دوٹوک اعلان کریں تاکہ دستور پاکستان کی نظریاتی حیثیت اور نئی حکومت کے حوالے سے بے جا شکوک و شبہات نہ پھیل سکیں۔

2- دوم یہ کہ فرقہ وارانہ دہشت گردی کے عنوان پر گزشتہ برسوں میں جو تباہی مچی ہے اس کا پوری سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اس دوران سنی اور شیعہ مکاتب فکر کے سینکڑوں علماء اور اراکین جاں بحق ہوئے ہیں، ہزاروں افراد کے خلاف مقدمات درج ہیں جن میں بہت سے لوگ سالہا سال سے جیلوں میں بند ہیں۔ سینکڑوں افراد پولیس مقابلوں میں مارے گئے ہیں مگر فرقہ وارانہ کشیدگی اپنے تمام تر اسباب و عوامل سمیت پوری طرح بدستور موجود ہے۔ اس لیے نئی حکومت کو چاہیے کہ وہ سپریم کورٹ کے جج کی سربراہ میں اعلیٰ عدالتی انکوائری کمیشن قائم کرے جو سنی شیعہ کشیدگی کے اسباب و عوامل کی نشاندہی کرے، دونوں طرف کے مارے جانے والے رہنماؤں اور کارکنوں کے مقدمات کا جائزہ لے، پولیس مقابلوں میں مارے جانے والے افراد کے کیسوں کی انکوائری کرے اور ملک بھر کے تھانوں میں درج ان ہزاروں مقدمات کی میرٹ کی بنیاد پر چھان پھٹک کرے جو دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کے خلاف درج کروا رکھے ہیں اور جن میں سے اکثر مقدمات کی بنیاد محض مخاصمت اور عناد ہے۔ جبکہ ان مقدمات کے تحت بہت سے افراد سالہا سال سے جیلوں میں بند چلے آرہے ہیں۔

3- سوم یہ کہ مسئلہ کشمیر، طالبان، اسامہ بن لادن اور پاکستان کے دینی مدارس کے بارے میں امریکی دباؤ کو مسترد کرنے کا واضح اعلان ضروری ہے۔ اور اس سلسلہ میں شرکاء محفل نے اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ اگر فوجی حکومت امریکی دباؤ کو مسترد کر کے قومی وقار اور خودمختاری کے

تحفظ کے لیے مضبوط موقف اختیار کرے تو اسے ملک کے عوام بالخصوص دینی حلقوں کی طرف سے بھرپور حمایت ملنی چاہیے اور ایسی صورت میں مجلس عمل علماء اسلام پاکستان کو سرگرم کردار ادا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

مجلہ / مقام / زیر اہتمام:

روزنامہ اوصاف، اسلام آباد

تاریخ اشاعت: ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء

مولانا مفتی محمودؒ اور اکرم درانی

اکرم درانی صاحب سے ممکن ہے کسی موقع پر ملاقات ہوئی ہو مگر مجھے یاد نہیں ہے۔ اور صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ کے لیے ان کے انتخاب سے قبل اخبارات میں کبھی کبھار ان کا نام پڑھنے کے علاوہ ان کا کوئی تعارف ذہن میں نہیں تھا۔ اس لیے مجھے متحدہ مجلس عمل کی طرف سے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کے منصب کے لیے ان کے چناؤ پر تعجب ہوا کہ اس انتہائی نازک اور حساس موقع پر اس انتہائی اہم منصب کے لیے کسی معروف اور بھاری بھرکم شخصیت کی بجائے ان کا انتخاب آخر کس بنیاد پر کیا گیا ہے؟

رمضان المبارک سے قبل میں برطانیہ میں تھا اور ماہ مبارک کے دوسرے ہفتے کے دوران وطن واپسی ہوئی ہے۔ تب سے گوجرانوالہ میں رمضان المبارک کے حوالہ سے مقامی مصروفیات کے حصار میں ہوں جس کی وجہ سے متحدہ مجلس عمل کے قائدین میں سے کسی سے ملاقات بھی ابھی تک نہیں ہو پائی۔ ورنہ ملاقات کی صورت میں پہلا سوال ذہن میں یہی تھا کہ اکرم درانی کون ہیں

اور اتنے اہم اور نازک منصب کے لیے ان کا انتخاب کیسے کر لیا گیا ہے؟ میرا خیال تھا کہ اگر آئینی رکاوٹ نہ ہو تو صوبہ سرحد کا وزیر اعلیٰ مولانا فضل الرحمن، مولانا سمیع الحق، یا قاضی حسین احمد میں سے کسی کو ہونا چاہیئے۔ کیونکہ افغانستان کے پڑوس میں متحدہ مجلس عمل کی صوبائی حکومت کو اپنے منشور پر عملدرآمد بلکہ کاروبار حکومت چلانے میں بھی جن رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے اور جن چیلنجوں کے امکانات دن بدن واضح ہوتے جا رہے ہیں ان سے نمٹنے کے لیے صرف صوبائی اسمبلی میں اکثریت اور اچھے وزراء کی ٹیم کافی نہیں ہوگی بلکہ حکومتی ٹیم کے کپتان کے طور پر کسی بھاری بھرکم شخصیت کی بھی ضرورت ہوگی۔

چنانچہ صوبہ سرحد کی وزارت اعلیٰ کے لیے متحدہ مجلس عمل کی طرف سے جناب اکرم درانی کا نام سامنے آنے پر مجھے تشویش ہوئی اور پہلا تاثر ذہن میں یہ ابھرا کہ شاید ایم ایم اے کی قیادت کو صوبہ سرحد کی حکومت کا کاروبار چلانے میں متوقع مشکلات کا پوری طرح احساس نہیں ہے، یا وہ اس معاملہ میں اس قدر سنجیدہ نہیں ہے جتنا کہ اسے ہونا چاہیئے۔ بھلا ہو برادرم حامد میر صاحب کا کہ انہوں نے اپنے کالم ''قلم کمان'' میں یہ بتا کر میری تشویش ایک حد تک کم کر دی کہ اکرم درانی کا خاندانی تعلق فقیر ایپیؒ کے اس حریت پسند اور مجاہد گروہ سے ہے جس نے ایک عرصہ تک اس خطہ میں برطانوی استعمار کے تسلط کے خلاف جہاد آزادی کا محاذ گرم رکھا اور جس کا نام سامنے آتے ہی حریت اور جہاد کے حقیقی مفہوم سے آشنا مسلمانوں کی گردنیں عقیدت و محبت سے خم ہو جاتی ہیں۔

فقیر ایپیؒ تحریک آزادی کے نامور مجاہدین میں سے تھے اور حامد میر کے بیان کے مطابق اکرم درانی فقیر ایپیؒ کے دست راست حاجی گل نوازؒ کے پوتے ہیں، جن کا گھر انگریزوں نے اس جرم میں بموں سے اڑا دیا تھا اور ان کی جائداد ضبط کر کے کوڑیوں کے مول فروخت کر دی تھی کہ وہ

اپنے ملک اور قوم کی آزادی کے لیے ہتھیار اٹھائے ہوئے تھے۔ اور غیر ملکی قابضین سے وفاداری کی اسناد حاصل کرنے کی بجائے ان سے اپنے وطن سے نکل جانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ حاجی گل نوازؒ کا یہ پوتا اگر اپنے عظیم دادا کے ساتھ رشتے کے علاوہ فکری وابستگی بھی رکھتا ہے اور یقیناً رکھتا ہوگا تو میں متحدہ مجلس عمل کو اس حسن انتخاب پر داد دیتا ہوں اور جناب اکرم درانی کو صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کے حیثیت سے اپنی سیاسی زندگی کے ایک نئے دور کے آغاز پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اکرم درانی اور ان کی کابینہ نے حلف برداری کے مرحلہ سے گزر کر صوبہ سرحد کا کاروبار حکومت سنبھال لیا ہے اور اب انہیں خود کو اس اعتماد کا اہل ثابت کرنے کی لیے عملی پیش رفت کرنی ہے جس کا اظہار صوبہ سرحد کے عوام نے 10 اکتوبر کے انتخاب میں کھلے بندوں کیا ہے۔ اور انہیں ان توقعات پر پورا اترنے کے لیے بھی خود کو ہر وقت چوکس رکھنا ہے جو صوبہ سرحد سے باہر نہ صرف پاکستان کے دیندار عوام بلکہ دنیا بھر کی اسلامی تحریکات اور دینی کارکنوں نے صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت سے وابستہ کر لی ہیں۔

میں اس سے قبل ایک مضمون میں اس بات کا تذکرہ کر چکا ہوں کہ اسلامائزیشن کے حوالہ سے دنیا بھر کے دینی کارکن اور اسلامی تحریکات سب سے زیادہ پاکستان سے توقعات وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ان کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ 10 اکتوبر کے الیکشن کے بعد تین الگ الگ عرب ملکوں سے تعلق رکھنے والے دانشوروں نے مجھے یہ سمجھ کر صوبہ سرحد کا کاروبار حکومت بہتر چلانے کے لیے متعدد مشوروں سے نوازا کہ ان معاملات سے شاید میرا بھی کوئی عملی تعلق ہے یا میں بھی اس سلسلہ میں کوئی کردار ادا کر سکتا ہوں۔

ایک عرب دانش ور کا کہنا ہے کہ صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کے وزرائے کرام کو عوام کے روزمرہ مسائل کے حل میں زیادہ دلچسپی لینی چاہیئے، ذاتی کردار کے حوالہ سے دیانت، خدمت اور سادگی کی روایات کو زندہ کرنا چاہیئے، حکمرانوں اور عوام کے درمیان قائم کئے گئے مصنوعی فاصلوں کو کم کرنا چاہیئے، اور ایک ایسی دیانت دار، کفایت شعار، خدمت گزار اور با اصول حکومت کا نقشہ پیش کرنا چاہیئے جو دوسری حکومتوں سے واقعتا مختلف دکھائی دے۔ اور پھر آئندہ الیکشن میں ملک کے دوسرے صوبوں کے عوام بھی صوبہ سرحد کے عوام کی پیروی کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

صوبہ سرحد میں اس سے قبل مولانا مفتی محمودؒ بھی دس ماہ تک وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں۔ ان کا دور اگرچہ عبوری آئین کا دور تھا، ابھی 1973ء کا دستور نہیں آیا تھا اور مرکز اور صوبوں کے تعلقات کار اور تقسیم کار کا حتمی طور پر فیصلہ نہیں ہوا تھا جبکہ مفتی صاحبؒ صوبہ میں حکومت کے سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ دستور ساز اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر خان عبدالولی خان کے سرگرم رفیق کار کی حیثیت سے ایک فعال اپوزیشن راہ نما کا کردار بھی ادا کر رہے تھے۔ ان کے حکومت معاملات میں مرکز کی مداخلت کا یہ حال تھا کہ شراب پر پابندی جیسے مسئلہ پر ان کے پورے دور حکومت میں مرکز ان سے مسلسل خط و کتابت کرتا رہا جس کا مقصد ان پر دباؤ ڈال کر اس معاملہ میں انہیں اپنی پالیسی میں لچک پیدا کرنے پر مجبور کرنا تھا۔

مفتی مولانا محمودؒ نے ہمیں خود بتایا کہ انہوں نے وزارت اعلیٰ کا حلف اٹھاتے ہی جب صوبہ سرحد میں شراب کی تیاری، فروخت اور استعمال پر پابندی لگانے کا اعلان کیا تو مرکز نے ایک مراسلہ میں ان سے کہا کہ شراب کی مد میں صوبائی حکومت کو ٹیکس کی جو آمدنی ہوتی تھی وہ اس پابندی کی وجہ سے بند ہو جائے گی اور اس خسارہ کو پورا کرنے کے لیے مرکز ان کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔ مفتی

صاحبؒ نے جواب دیا کہ کوئی بات نہیں ہم اپنے اخراجات میں کمی کر کے یہ خسارہ پورا کر لیں گے۔

اس کے بعد مرکز کا دوسرا خط آیا کہ غیر مسلموں کے ہاں شراب حرام نہیں ہے اس لیے ان کے لیے بڑے شہروں میں شراب کی چند دکانیں کھول دینی چاہئیں۔ مفتی صاحبؒ نے اس کا جواب دیا کہ غیر مسلموں کو شراب پینے کی اجازت ہو سکتی ہے لیکن انہیں شراب مہیا کرنا ہماری ذمہ دار نہیں ہے۔

اس کے بعد مرکز سے تیسرا خط آیا کے بعض بیماریوں میں شراب بطور دوا استعمال ہوتی ہے اس لیے گنجائش کی کوئی صورت نکالنا ضروری ہے۔ مفتی صاحبؒ نے اس کے جواب میں صوبائی ہیلتھ سیکرٹری کی سربراہی میں ایک میڈیکل بورڈ بنا دیا اور اس کے ذمہ لگایا کہ وہ ایسی بیماری کی نشاندہی کرے جو مہلک ہو اور جس کا شراب کے علاوہ کوئی متبادل علاج موجود نہ ہو۔ مفتی صاحبؒ کا ارشاد یہ تھا کہ اگر واقعی ایسی کوئی بیماری موجود ہے جو مہلک ہے اور شراب کے علاوہ اس کا کوئی متبادل علاج نہیں ہے تو وہ ایسی بیماری کے لیے ہسپتالوں میں شراب کے استعمال کی اجازت دینے کیلئے تیار ہیں۔ لیکن میڈیکل بورڈ کی رپورٹ یہ تھی کہ ایسی کوئی بیماری سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

مولانا مفتی محمودؒ نے اس طرح کی رکاوٹوں، مشکلات اور مداخلت کے باوجود نہ صرف کاروبار حکومت کامیابی کے ساتھ چلایا بلکہ مرکز میں اپوزیشن راہ نما کا رول بھی باوقار طریقہ سے نبھایا، سادگی اور کفایت شعار کی نقشہ پیش کیا، اور پھر اصولوں کی خاطر از خود اقتدار سے الگ ہو کر دنیا کو بتا دیا کہ اہل حق اور اہل دین کے نزدیک اقتدار مقصد نہیں بلکہ مقاصد کے حصول کے لیے صرف ایک ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

جناب اکرم درانی نے مولانا مفتی محمودؒ کی یہ سیٹ سنبھالی ہے اور خوش قسمتی سے ان کا تعلق بھی مفتی صاحبؒ ہی کی جماعت سے ہے اس لیے لوگ ان سے بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے نہ صرف مولانا مفتی محمودؒ کی روایات کو زندہ کریں گے بلکہ ان کے مشن کو عملاً آگے بڑھانے کے لیے بھی سنجیدہ محنت کریں گے۔ مفتی صاحبؒ کی پشت پر تو مینڈیٹ بھی اتنا بڑا نہیں تھا اور چالیس کے ایوان میں ان کی اپنی پارٹی کی سیٹیں صرف چھ تھیں، باقی سب کچھ ان کی حکمت و تدبر کا کرشمہ تھا۔ اکرم درانی ان سے کہیں زیادہ و بھاری مینڈیٹ کے ساتھ صوبہ سرحد کے حکمران بنے ہیں اس لیے وہ زیادہ حوصلہ اور اعتماد کے ساتھ اپنے منشور کی طرف پیش رفت کر سکتے ہیں۔ البتہ ''حکمت و تدبر'' کے بارے میں انہیں مولانا مفتی محمودؒ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور انہی سے راہ نمائی حاصل کرنا ہوگی۔ اگر انہوں نے ایسا کرنے کا اہتمام کر لیا تو ان شاء اللہ تعالیٰ وہ متحدہ مجلس عمل اور اپنے ووٹروں کے ہاں سرخرو ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مشن اور منشور کے ساتھ بھی صحیح طور پر انصاف کر سکیں گے ۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس میں کامیابی اور سرخروئی عطا فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

مجلہ / مقام / زیر اہتمام:

روزنامہ اسلام، لاہور

تاریخ اشاعت: ۱۰ دسمبر ۲۰۰۲ء

مذہبی طبقات اور دینی جدوجہد کے عصری تقاضے

متحرک جماعتی زندگی سے کنارہ کشی کے بعد گزشتہ دو عشروں سے راقم الحروف دینی جدوجہد کے عصری تقاضوں اور دینی جماعتوں اور طبقات کی ذمہ داریوں کے حوالے سے کچھ نہ کچھ گزارشات پیش کر رہا ہے۔ معروضی حالات کے تناظر میں اس ''صدائے فقیر'' کے بعض پہلوؤں کو یہاں دہرانا مناسب معلوم ہوتا ہے:

پاکستان میں نفاذ شریعت کے لیے صرف سیاسی اور پارلیمانی جدوجہد کافی نہیں ہے، بلکہ پبلک دباؤ اور عوامی قوت بھی اس کی ناگزیر ضرورت ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ماضی کی طرح غیر سیاسی دینی قوتیں اور جماعتیں بھی میدان میں متحرک رہیں۔ بالخصوص اس وقت ایک نئی دینی جماعت کی ضرورت ہے جو غیر سیاسی ہو اور مختلف مکاتب فکر کی نمائندگی کرتی ہو۔ ''غیر سیاسی'' سے میری مراد یہ ہے کہ وہ جماعت ووٹ، الیکشن اور اقتدار کی سیاست سے الگ رہے، پاور پالیٹکس کا حصہ بننے کی بجائے مشترکہ دینی، ملی اور قومی مقاصد کے لیے تحریکی انداز میں کام کرے اور رائے عامہ، عوامی دباؤ اور اسٹریٹ پاور کے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کرے جو دینی تحریکات کی اصل قوت ہوا کرتی تھی اور جو ہم نے خاصی حد تک کھو دی ہے۔

دینی جماعتوں اور حلقوں کے درمیان کشمکش اور ایک دوسرے کے کام کی نفی اور استخفاف واستحقار کا روز افزوں ذوق ومزاج ہمارے لیے زہر قاتل ہے۔ اس کی حوصلہ شکنی ضروری ہے اور دینی جدوجہد کو صحیح رخ پر آگے بڑھانے کے لیے انتہائی درجہ میں لازم ہے کہ ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کیا جائے، ایک دوسرے کے کام کا احترام کیا جائے اور باہمی مشاورت، مفاہمت اور تعاون کی فضا قائم کی جائے۔

ہماری دینی جدوجہد خصوصاً نفاذ اسلام کی تحریک کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ اس سلسلے میں کام کرنے والی بہت سی جماعتیں مسلکی دائروں میں محدود ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک خاص حد سے آگے بڑھ نہیں پا رہیں۔ میں اس سلسلے میں یہ حوالہ دینا چاہوں گا کہ

انقلاب ایران کے بعد مجھے علماء کرام اور وکلا کے ایک وفد کے ساتھ ایران جانے کا موقع ملا جس میں مولانا منظور احمد چنیوٹی اور حافظ حسین احمد بھی شامل تھے۔ یہ ۱۹۸۷ء کی بات ہے۔ اس موقع پر ایک مجلس میں یہ سوال سامنے آیا کہ کیا پاکستان میں کوئی عالم دین اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ خمینی صاحب کی طرح ایک عوامی انقلاب کی قیادت کر سکے؟ میں نے عرض کیا کہ ایک نہیں بلکہ ہمارے پاس دو شخصیات ایسی موجود تھیں جو خمینی بن سکتی تھیں۔ ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفی کے بعد مولانا مفتی محمود یا مولانا شاہ احمد نورانی میں سے جو بھی آگے بڑھتا، قوم اس کو خمینی کا مقام دینے کے لیے تیار ہوتی، مگر مصیبت یہ ہے کہ مولانا مفتی محمود آگے بڑھتے تو مولانا شاہ احمد نورانی کے پیروکار ان کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے اور اگر مولانا شاہ احمد نورانی پیش رفت کرتے تو یہ بات مولانا مفتی محمود کے پیروکاوں کے لیے قابل قبول نہ ہوتی۔

ہمارے ہاں نفاذ اسلام کی جدوجہد کا گیئر ہمیشہ اس مقام پر آکر پھنس جاتا ہے۔ یہ ایک معروضی حقیقت ہے جس کی جتنی بھی تاویل کر لی جائے، مگر اس کے وجود سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے میرے نزدیک کسی دینی جدوجہد یا تحریک کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسلکی ترجیحات سے بالاتر ہو اور اس کے لیے میرے خیال میں قیام پاکستان سے پہلے کی ''مجلس احرار اسلام'' ایک اچھی مثال ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام اور دیگر طبقات کے اہل دانش نے مل کر ایک جماعت تشکیل دی اور مسلکی ترجیحات سے بالاتر ہو کر ملی وقومی مقاصد کے لیے عوامی جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔

ہمارے دینی مدارس فکری تربیت کے حوالے سے بانجھ ہو چکے ہیں اور وہ فضا اب کسی حد تک بھی موجود نہیں ہے جو اب سے تیس برس پہلے تک مدارس میں فکری، اخلاقی بلکہ دینی تربیت کے حوالے سے دکھائی دیتی تھی۔ ہمارے طلبہ بلکہ مدرسین کی اکثریت کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ہماری ماضی قریب کی دینی وملی تحریکات کن مقاصد کے لیے تھیں، جنگ آزادی میں کون کون سے حضرات نے قائدانہ کردار ادا کیا اور دیگر ملی تحریکات کے اہداف کیا تھے۔ ہمارے مدارس میں ذہنی تیاری اور فکری تربیت کے دائرے محدود سے محدود تر ہوتے جا رہے ہیں جس سے کنفیوژن اور ذہنی انتشار بڑھتا جا رہا ہے اور اسی کیفیوژن اور ذہنی انتشار سے بہت سی پس پردہ قوتیں مسلسل ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ یہ مسئلہ بڑے دینی مدارس اور وفاق المدارس کے سوچنے کا ہے، مگر وہاں بھی اس کے بظاہر کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے۔

اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ کئی برس سے میرا معمول ہے کہ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں دورۂ حدیث کے طلبہ کو ہفتہ وار لیکچر کی صورت میں انسانی حقوق، معاصر مذاہب کے تعارف، ماضی قریب کی دینی تحریکات اور پاکستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد کے فکری و علمی پہلوؤں کی طرف سرسری انداز میں توجہ دلانے کی کوشش کرتا ہوں تو بہت سے طلبہ میرے منہ کی طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے میں اس دنیا کی نہیں، بلکہ کسی اور دنیا کی بات کر رہا ہوں اور شاید میں انھیں اس طرح گمراہ کر کے ''اکابر'' کے مسلک سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ہمارے ہاں فکری تربیت کے فقدان کا ایک نامحمود نتیجہ اور ثمرہ یہ بھی ہے کہ ہم سب نے خود کو اختلاف او رتنقید سے بالاتر سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ گزشتہ دنوں ایک دوست میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ فلاں صاحب نے آپ کے خلاف کتاب لکھی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر انھیں میری کچھ باتوں سے اختلاف ہے تو ان پر لکھنا ان کا حق ہے۔ فرمانے لگے کہ

انھوں نے آپ پر سخت تنقید کی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بھی ان کا حق ہے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ آپ اس کا جواب لکھیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ میرا موقف بھی لوگوں کے سامنے ہے، ان کا موقف بھی آگیا ہے۔ لوگ خود فیصلہ کر لیں گے کہ کس کی بات درست ہے۔ میں نے ان سے یہ بھی گزارش کی کہ جماعت اسلامی کے ساتھ ہمارا نصف صدی سے یہ اختلاف چلا آرہا ہے کہ انھوں نے اپنے دستور میں صحابہ کرام کو تنقید سے بالاتر تسلیم نہیں کیا، حالانکہ اہل سنت کا صدیوں سے یہ موقف ہے کہ صحابہ کرام تنقید سے بالاتر ہیں، مگر اب صورت حال یہ ہے کہ ہم نے صحابہ کرام کے ساتھ تنقید سے بالاتر ہونے والوں کا دائرہ بہت زیادہ وسیع کر لیا ہے جسے مزید وسیع کرتے جا رہے ہیں اور خود بھی اس میں شامل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

نفاذ شریعت کا راستہ روکنے کا کام عالمی سطح پر ہے اور بین الاقوامی لابیاں اس کے لیے مسلسل متحرک ہیں۔ ان کے کام کو سمجھنا، طریق واردات سے واقفیت حاصل کرنا اور ان کے سد باب کے لیے منصوبہ بندی کرنا بھی دینی جماعتوں کی ذمہ داری ہے۔ نفاذ شریعت کے لیے سطحی نعرے بازی اور جذباتی تقریروں سے آگے بڑھ کر ذہن سازی، ہوم ورک، لابنگ، ذرائع ابلاغ کا بھرپور استعمال اور دینی قوتوں کا باہمی ربط وتعاون بھی ضروری ہے۔ ہمارے مدارس کے طلبہ، مدرسین، دینی جماعتوں کے راہ نما اور کارکن اور مساجد کے ائمہ وخطبا کی غالب اکثریت اسلام اور مغرب کے درمیان انسانی حقوق کے عنوان سے لڑی جانے والی عالمی ثقافتی جنگ سے سرے سے واقف نہیں ہے، اس لیے مدرسین اور طلبہ کو اس کے لیے تیار کرنا اور یونانی فلسفہ کی طرح مغربی فلسفہ کو تدریسی نصاب میں شامل کرنا دینی مدارس کے فرائض میں شامل ہے۔ اسی طرح علمی مسائل اور خاص طور پر جدید فکری اور ثقافتی مسائل پر باہمی بحث ومباحثہ وقت کی

اہم ضرورت ہے اور محاذ آرائی سے ہٹ کر علمی انداز میں اس بحث و مباحثہ کو آگے بڑھانے اور اس کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔

مجلہ / مقام / زیر اہتمام:

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

تاریخ اشاعت: فروری ۲۰۱۰ء

موجودہ ملکی و علاقائی صورت حال میں علماء دیوبند کا ''مشترکہ موقف''

۱۵ اپریل ۲۰۱۰ء کو جامعہ اشرفیہ لاہور میں ملک بھر سے ڈیڑھ سو کے لگ بھگ سرکردہ علماء کرام کا ایک بھرپور اور نمائندہ اجتماع منعقد ہوا جن کا تعلق دیوبندی مسلک سے تعلق رکھنے والی دینی و سیاسی جماعتوں، دینی مدارس اور علمی مراکز سے تھا، ایک عرصہ کے بعد مسلکی حوالہ سے اس قدر بھرپور اور نمائندہ اجتماع دیکھنے میں آیا جبکہ ملکی صورت حال اور علماء دیوبند کے بارے میں ملکی، علاقائی اور عالمی سطح پر کیے جانے والے مسلسل اعتراضات اور پھیلائے جانے والے شکوک و شبہات کے پس منظر میں اس قسم کے اجتماع کی ضرورت کافی عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی۔

اس سے قبل ۱۳۔۱۴، اپریل کو جامعہ اشرفیہ میں ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ اکابر علماء کرام باہم سر جوڑے، بیٹھے رہے اور پیش آمدہ واقعات و حالات کے تناظر میں مسلکی بنیاد پر کوئی اجتماعی موقف طے کرنے کے لئے ان کے درمیان مشاورت چلتی رہی۔

اس اجتماع اور مشاورت میں شریک ہونے والے حضرات میں صدر وفاق المدارس و صدر اجلاس حضرت مولانا سلیم اللہ خان، مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق سکندر، مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا محمد تقی عثمانی، مولانا فضل الرحمن، مولانا سمیع الحق، مولانا مفتی غلام الرحمن، مولانا عبد المجید آف کہروڑپکا، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا عبید اللہ اشرفی، مولانا فضل الرحیم، مولانا عبد الرحمن اشرفی، مولانا سید عبد المجید ندیم، مولانا محمد احمد لدھیانوی، ڈاکٹر خادم حسین ڈھلوں، مولانا اللہ وسایا، مولانا اشرف علی، مولانا عبد السلام، مولانا قاضی ارشد الحسینی، حافظ حسین احمد، مولانا پیر عزیز ارحمن ہزاروی ، مولانا مفتی حبیب الرحمن درخواستی، مولانا محمد عبد اللہ آف بھکر، مولانا انوار الحق حقانی، مفتی کفایت اللہ ہزاروی اور مولانا سعید یوسف خان بطور خاص قابل ذکر ہیں، راقم الحروف بھی مسلسل تین روز تک اس مشاورت میں شریک رہا اور مشترکہ موقف اور قرار دادوں کی تیاری میں حصہ لینے کی سعادت حاصل کی ۔

جامعہ اشرفیہ کی انتظامیہ بالخصوص مولانا حافظ فضل الرحیم نے مشاورت اور اجتماع کے انتظامات اور سینکڑوں علماء کرام کے اعزاز و اکرام اور خدمت میں جس قدر محنت اور جانفشانی سے کام لیا اسے تمام شرکاء نے سراہا جبکہ علماء کرام کے ساتھ رابطوں ، انہیں شرکت کے لئے آمادہ کرنے اور دوران مشاورت تمام امور کو مفاہمت کے دائرے میں رکھنے کے لئے وفاق المدارس العربیہ کے ناظم اعلیٰ مولانا قاری محمد حنیف جالندھری مسلسل متحرک رہے ، اس طویل اور ہمہ جہت مشاورت کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ تمام حضرات نے باہمی مشاورت و مفاہمت کے بھرپور جذبہ کے ساتھ متعلقہ امور پر اظہار خیال کیا، آپس کے گلے شکوے سنے، غلط فہمیوں کا ازالہ کیا، مسائل کا گہرائی میں جا کر حقیقت پسندانہ جائزہ لیا، مستقبل میں مل کر چلنے کا عزم کیا اور اس قسم کی اجتماعی مشاورت کے لئے وقتاً فوقتاً ملتے رہنے کا عہد کیا۔

اجتماع کا مشترکہ اعلامیہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی نے تحریر کیا اور قراردادوں کی ترتیب راقم الحروف کے ذمہ تھی، ان پر ابتدائی مشاورت اور ۱۵ اپریل کے وسیع تر اجلاس میں تفصیلی بحث و تمحیص اور ترامیم کے بعد متعدد ترامیم کی گئیں، اور متفقہ طور پر ان کی منظوری دی گئی،یہ مشترکہ اعلامیہ جو موجودہ حالات میں پاکستان میں علماء دیوبند کے متفقہ موقف کی حیثیت رکھتا ہے اور قراردادیں قارئین کی خدمت میں ان گزارشات کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں کہ ان کا پوری سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور اس باہمی مشاورت اور مشترکہ اعلامیہ کی روح کے مطابق ہر سطح پر باہمی اشتراک و معاونت کو فروغ دیا جائے تاکہ ہم سب مل کر وقت کے چیلنجز اور تقاضوں کے مطابق اکابر علماء دیوبند رحمہم اللہ تعالیٰ کے مشن اور پروگرام کو آگے بڑھا سکیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یا رب العالمین۔

مشترکہ اعلامیہ

ملک بھر کے علماء کا یہ اجتماع عام مسلمانوں کے اس احساس میں برابر کا شریک ہے کہ ہمارا ملک جن گوناگوں مسائل سے دوچار ہے، اور اپنی تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ نفاذ اسلام کے جس عظیم مقصد کے لئے مملکت خداداد حاصل کی گئی اس کی طرف سے مجرمانہ غفلت برتی گئی ہے اور عملاً اسلامی نظام زندگی اور اسلامی نظام عدل کی طرف پیش قدمی کی بجائے ہم اس منزل سے دور ہوتے چلے گئے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک بھر کے عوام ہمہ جہتی مسائل کی چکی میں پس رہے ہیں ملک بھر میں کسی کی جان و مال کا کوئی تحفظ نہیں ہے قتل و غارت گری اور دہشت گردی سے ہر شخص سہما ہوا ہے اور مجرم دندناتے

پھرتے ہیں، سرکاری محکموں میں رشوت ستانی اور بدعنوانی کا عفریت ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے اور عوام کے لئے اپنا جائز حق حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف بن گیا ہے، ناقص منصوبہ بندی کے نتیجے میں مہنگائی اور بجلی کی قلت نے عوام کو عذاب میں مبتلا کیا ہوا ہے جس سے بے روزگاری میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔

دوسری طرف ہمارے ملک کے بہترین وسائل ان عوامی تکلیفوں کو دور کرنے اور ان کے اسباب کا ازالہ کرنے کی بجائے امریکا کی مسلط کی ہوئی جنگ میں امریکی مفادات کے تحفظ کے لئے خرچ ہو رہے ہیں، جبکہ امریکا کی طرف سے ہماری سرحدوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی کر کے ان پر ڈرون حملوں کا سلسلہ برابر جاری ہے جن میں ہمارے بے گناہ شہریوں کی بہت بڑی تعداد شہید ہو رہی ہے اور یہ بات واضح ہے کہ امریکا دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر جگہ جگہ بے گناہ مسلمانوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنا رہا ہے اور خود ہمارے شہریوں کے ساتھ امریکا میں بد ترین ذلت آمیز سلوک کیا جاتا ہے اور امریکا مسلسل ہمارے بجائے بھارت کو نوازتے رہنے کی پالیسی پر گامزن ہے۔

اس سب کے باوجود حکومت کی پالیسیوں میں امریکی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ملکی مفادات کو بے دھڑک قربان کیا جا رہا ہے، جب اجتماعی سطح پر مسلمانوں کو اس قسم کے مسائل درپیش ہوں تو اس وقت بطور خاص اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے اس کی نافرمانیوں سے بچا جائے لیکن ان حالات میں بھی بددینی کو فروغ مل رہا ہے، عریانی و فحاشی پر کوئی روک نہیں، نفاذ شریعت کی پر امن کوششوں کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا جاتا، ان تمام حالات میں ملک کے درد مند مسلمان سخت بے چینی کا شکار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین عطا فرمایا ہے جس میں نہ مایوسی کی کوئی گنجائش ہے اور نہ بے عملی کی لہٰذا یہ تمام حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ ملک کے ارباب حل و عقد اور عوام ایک دوسرے کو نشانہ ملامت بنانے کی بجائے مل جل کر اپنے طرز عمل میں انقلابی تبدیلیاں لائیں، اسی طرح ملک کی کشتی گرداب سے نکل سکتی ہے، اسی لئے علماء کرام کا یہ اجتماع بلایا گیا تھا کہ وہ اس صورت حال پر غور کر کے قرآن و سنت کی روشنی میں وہ طریقے تجویز کریں جو ملک کو اس صورت حال سے نکالنے کے لئے ضروری ہیں، چنانچہ یہ اجتماع متفقہ طور پر سمجھتا ہے کہ مندرجہ ذیل اقدامات ناگزیر ہیں۔

1- اس بات پر ہمارا ایمان ہے کہ اسلام ہی نے یہ ملک بنایا تھا اور اسلام ہی اسے بچا سکتا ہے لہٰذا حکومت کا فرض ہے کہ وہ ملک میں اسلامی تعلیمات اور قوانین کو نافذ کرنے کے لئے مؤثر اقدامات کرے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارا دینی فریضہ بھی ہے اور ملک کے آئین کا اہم ترین تقاضا بھی اور اسی کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ملک میں انتہا پسندی کی تحریکیں اٹھی ہیں، اگر ملک نے اس مقصد وجود کی طرف واضح پیش قدمی کی ہوتی تو ملک اس وقت انتہا پسندی کی گرفت میں نہ ہوتا لہٰذا وقت کا اہم تقاضا ہے کہ پر امن ذرائع سے پوری نیک نیتی کے ساتھ ملک میں نفاذ شریعت کے اقدامات کیے جائیں، اس کے لئے اسلامی نظریاتی کونسل اور فیڈرل شریعت کورٹ کو فعال بنا کر ان کی سفارشات اور فیصلوں کے مطابق اپنے قانونی اور سرکاری نظام میں تبدیلیاں بلا تاخیر لائی جائیں اور ملک سے کرپشن، بے راہ روی اور فحاشی و عریانی ختم کرنے کے لئے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔

2- تمام سیاسی اور دینی جماعتوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے دوسرے مقاصد پر نفاذ شریعت کے مطالبے کو اولیت دے کر حکومت پر دباؤ ڈالیں اور اس کے لئے موثر مگر پر امن جد و جہد کا

اہتمام کریں اور عوام کا فرض ہے کہ جو جماعتیں اور ادارے اس مقصد کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں ان کے ساتھ مکمل تعاون کریں۔

3- اس وقت ملک کا سب سے بڑا مسئلہ دہشت گردی کو قرار دیا جا رہا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دہشت گردی نے ملک کو اجاڑنے میں کوئی کسر چھوڑ نہیں رکھی، جگہ جگہ خود کش حملوں اور تخریبی کارروائیوں نے ملک کو بد امنی کی آماج گاہ بنایا ہوا ہے، ان تخریبی کارروائیوں کی تمام محب وطن حلقوں کی طرف سے بار بار مذمت کی گئی ہے اور انہیں سراسر نا جائز قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ کارروائیاں مستقل جاری ہیں لہٰذا اس صورت حال کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ آخر ملک بھر کی متفقہ مذمت اور فوجی طاقت کے استعمال کے باوجود یہ کارروائیاں کیوں جاری ہیں اور اس کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟ ہماری نظر میں اس صورتحال کا بہت بڑا سبب وہ افغان پالیسی ہے جو جنرل پرویز مشرف نے غلامانہ ذہنیت کے تحت کسی تحفظ کے بغیر شروع کر دی تھی اور آج تک اسی پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے، لہٰذا ہمارا مطالبہ ہے کہ حکومت امریکا نوازی کی اس پالیسی کو ترک کر کے افغانستان کی جنگ سے اپنے آپ کو بالکل الگ کرے اور امریکی افواج کو مدد پہنچانے کے تمام اقدامات سے دستبردار ہو۔

4- یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حکومت کی غلط پالیسیوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم خود اپنے گھر کو آگ لگا بیٹھیں، لہٰذا ہم پورے اعتماد اور دیانت کے ساتھ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ پاکستان کے موجودہ حالات میں نفاذ شریعت اور ملک کو غیر ملکی تسلط سے نجات دلانے کے لئے پر امن جد و جہد ہی بہترین حکمت عملی اور مسلح جد و جہد شرعی اعتبار سے غلط ہونے کے علاوہ مقاصد کے لئے بھی سخت مضر ہے اور اس کا براہ راست فائدہ ہمارے دشمنوں کو پہنچ رہا ہے اور امریکا اسے اس علاقے میں اپنے اثر و رسوخ کو دوام بخشنے کے لئے استعمال کر رہا ہے، اگر کوئی شخص

اخلاص کے ساتھ اسے دین کا تقاضا سمجھتا ہے تو یہ اجتماع اس بات پر اتفاق کرتا ہے کہ ایسے حضرات کو حالات کے تقاضوں اور ضرورتوں سے آگاہ کر کے مثبت کردار کی ادائیگی پر آمادہ کرنے کے لئے ناصحانہ اور خیر خواہانہ روش اختیار کی جائے۔

5- حکومت اس بات کا احساس کرے کہ اندرونی شورشوں کا پائیدار حل بالآخر پرامن مذاکرات کے سوا کچھ نہیں ہوتا، چنانچہ ملک کی پارلیمنٹ نے اس حوالے سے اپنی متفقہ قرارداد میں ایک طرف سابق حکمرانوں کی خارجہ پالیسی پر نظر ثانی کرنے اور ڈرون حملوں اور غیر ملکی مداخلت کے بارے میں قومی خودمختاری کے تحفظ پر زور دیا تھا اور دوسری طرف اندرونی شورش کے لئے مذاکرات ہی کا طریقہ تجویز کیا تھا لیکن پارلیمنٹ کی اس قرارداد کو عملاً بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، لہٰذا حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس قرارداد کے مطابق اپنی حکمت عملی کو تبدیل کر کے خانہ جنگی کا خاتمہ کرے۔

6- تمام مسلمانوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ مشکلات اور مصائب کا اصل حل اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے ساتھ اس کی رحمتیں حاصل نہیں کی جا سکتیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور ہر طرح کے گناہوں سے توبہ کر کے رشوت ستانی اور ہر طرح کی حرام آمدنی، بے حیائی اور فحاشی، جھوٹ، غیبت اور دنیوی اغراض کے لئے باہمی جھگڑوں سے پرہیز کریں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں، شرعی فرائض کو بجا لائیں اور اتباع سنت کا اہتمام کریں۔

قراردادیں

1- یہ اجتماع موجودہ ملکی اور علاقائی سنگین صورت حال کو ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' میں نفاذ اسلام سے مسلسل روگردانی اور ایک اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے تقاضوں کو نظر انداز کرنے کا منطقی نتیجہ قرار دیتا ہے اور دوٹوک رائے کا اظہار کرتا ہے کہ قومی خود مختاری کے تحفظ اور نفاذ اسلام کے بغیر ملک و قوم کو موجودہ دلدل سے نکالنا ممکن نہیں ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ دستور پاکستان کی اسلامی دفعات اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق نفاذ اسلام کی طرف عملی پیش رفت کا اہتمام کیا جائے۔

2- یہ اجتماع قومی خود مختاری اور ملکی سالمیت کو درپیش مبینہ خطرات و خدشات کے حوالہ سے شدید تشویش و اضطراب کا اظہار کرتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ عوامی جذبات اور قومی مفادات کی پاسداری کرتے ہوئے اپنی داخلی اور خارجی پالیسیوں پر فوری نظر ثانی کرے اور پارلیمنٹ کی متفقہ قرارداد اور پارلیمانی کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد کر کے قومی پالیسیوں کا قبلہ درست کرنے کو یقینی بنائے۔

3- یہ اجتماع امریکہ میں پاکستانی ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے ساتھ ناروا سلوک اور سفاکانہ وغیر منصفانہ رویے کی شدید مذمت کرتا ہے اور حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتا ہے کہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی اور دیگر سینکڑوں گمشدہ یا امریکہ کے حوالے کیے جانے والے مظلوم پاکستانیوں کی بازیابی اور رہائی کے لئے اپنی دستوری اور قومی ذمہ داریوں کو پورا کرے۔

4- یہ اجتماع سوئٹزر لینڈ میں مساجد کے میناروں پر پابندی بعض یورپی ممالک میں جناب نبی اکرمؐ کے گستاخانہ خاکوں کی مسلسل اشاعت، فرانس میں حجابِ شرعی کے خلاف مہم اور اس قسم

کے دیگر معاملات کو اسلام کے خلاف مغربی ثقافت کے علمبرداروں کے معاندانہ رویے کا آئینہ دار سمجھتا ہے اور دنیا بھر کی مسلم حکومتوں اور اسلامی سربراہ کانفرنس کی تنظیم (او، آئی، سی) سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات و احکام کے خلاف مغربی ثقافتی یلغار کے سدِّ باب کے لئے مشترکہ پالیسی وضع کریں۔

5- یہ اجتماع دینی مدارس کے خلاف مختلف ایجنسیوں اور حکومتی اداروں کی روز افزوں اور مسلسل کارروائیوں پر شدید احتجاج کرتا ہے اور آپریشن سے متاثرہ علاقوں میں سینکڑوں مساجد و مدارس کے انہدام کو شرمناک قرار دیتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ دینی مدارس پر چھاپوں اور ان کے اساتذہ و طلبہ کے خلاف کارروائیوں کا سلسلہ فوری بند کر کے منہدم شدہ اور متاثرہ مدارس و مساجد کی فوری بحالی کا اہتمام کیا جائے اور بندمدارس کو کھول کر ان میں طلبہ کی رہائش و تعلیم کا نظام بحال کیا جائے۔

6- یہ اجتماع ملک میں روز افزوں مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ کے عذاب کو غریب عوام سے زندگی چھین لینے کے مترادف تصور کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ سرمایہ دارانہ، جاگیر دارانہ نظام کے تسلسل اور غلط حکومتی پالیسیوں کے باعث اس عذاب میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور عام شہریوں پر زندگی کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ اجتماع حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ عوام کو مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ کے اس عذاب سے نجات دلانے کے لئے اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کے ساتھ ساتھ ہنگامی بنیادوں پر اقدامات کا بھی اہتمام کرے۔

7- یہ اجتماع ملک میں مغرب کی بے حیاء ثقافت کے فروغ کے لئے این جی اوز اور میڈیا کی آزاد انہ روش، حکومتی اداروں کی طرف سے اس کی حوصلہ افزائی اور قومی وسائل کے بے دریغ استعمال کو افسوس ناک قرار دیتا ہے اور اسے پاکستان کے اسلامی تشخص، قرآن و سنت کی

تعلیمات اور عوام کے دینی رجحانات کے منافی سمجھتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس پالیسی پر نظر ثانی کی جائے اور وطن عزیز کی اسلامی ثقافت کے تحفظ کا اہتمام کیا جائے۔

8- یہ اجتماع بارہ ربیع الاول کے روز فیصل آباد، ڈیرہ اسماعیل خان، کراچی اور بعض دیگر شہروں میں رونما ہونے والے افسوس ناک واقعات کو ملک میں فرقہ وارانہ کشمکش کو فروغ دینے کی سازش کا حصہ قرار دیتا ہے اور ان سانحات میں متاثرہ افراد اور خاندانوں کے ساتھ گہری ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ ایسے واقعات کی مکمل عدالتی تحقیقات کرا کے مجرموں اور ان کے پشت پناہوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

9- یہ اجتماع ملک کے تمام مکاتب فکر کے رہنماؤں اور کارکنوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ موجودہ سنگین قومی صورت حال میں جبکہ قومی خود مختاری، ملکی سالمیت اور پاکستان کے اسلامی تشخص کو داؤ پر لگا دیا گیا ہے اور فرقہ وارانہ کشیدگی کی فضاء پیدا کر کے استعماری قوتیں اپنے مذموم مقاصد کو آگے بڑھانے کا ایجنڈا رکھتی ہیں ۔۔۔ قومی وحدت اور ہم آہنگی وقت کا اہم ترین تقاضا ہے، اس لئے کسی بھی سطح پر ایسی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے جو فرقہ وارانہ کشمکش کا باعث بن سکتی ہوں بلکہ قومی ہم آہنگی کو بڑھانے کے اقدامات کیے جائیں تاکہ قوم متحد ہو کر موجودہ بحران کا مقابلہ کر سکے۔

10- یہ اجتماع پارلیمنٹ میں دستوری ترامیم کے حالیہ بل میں اسلامی دفعات کے تحفظ کی جدو جہد کرنے والے علماء کرام اور دیگر ارکان پارلیمنٹ کو اس کامیاب جد و جہد پر مبارک باد پیش کرتا ہے اور دستور کی اسلامی دفعات کے تحفظ پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے پارلیمنٹ سے مطالبہ کرتا ہے کہ ان اسلامی دفعات پر مؤثر عمل درآمد کے لئے بھی اقدامات کیے جائیں ۔

11- یہ اجتماع ملک بھر کے علماء کرام اور دینی جماعتوں و کارکنوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ قومی وحدت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے باہمی اختلافات کے عمومی اظہار سے حتی الوسع گریز کریں اور مشترکہ قومی و دینی مقاصد کے لئے باہمی تعاون و اشتراک کی فضا کو فروغ دیں ،نیز یہ اجتماع قوم کے تمام طبقات اور حلقوں سے بھی اپیل کرتا ہے کہ وہ قومی وحدت کے بھرپور مظاہرہ کے ساتھ بیرونی مداخلت کا راستہ روکنے کا اہتمام کریں۔

12- یہ اجتماع ملک بھر کے علماء کرام کے اس نمائندہ اجتماع کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً اس قسم کے مشترکہ اجتماعات کا انعقاد جاری رکھنے کا اعلان کرتا ہے۔

13- یہ اجتماع میڈیا سے اسلامی شعائر اور دینی حلقوں کے خلاف کردار کشی کے مسلسل پروپیگنڈے پر شدید احتجاج کرتا ہے اور خاص طور پر میڈیا چینلز پر ایک لڑکی کو کوڑے مارے جانے کی ویڈیو کے بارے میں اس انکشاف کی بنیاد پر کہ یہ جعلی طور پر فلمائی گئی تھی حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس کی انکوائری کرا کے اسلامی احکام کو تمسخر کا نشانہ بنانے والوں کے خلاف کارروائی عمل میں لائی جائے۔

14- ایبٹ آباد میں جلسے اور جلوس پر بے تحاشا فائرنگ اور اس کے نتیجہ میں متعدد افراد کے قتل کے واقعہ کی شدید مذمت کرتا ہے اور ہزارہ کے مظلوم عوام سے مکمل ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

15- یہ اجتماع کراچی میں مولانا سعید احمد جلال پوریؒ، مولانا عبد الغفور ندیمؒ، قاری عبد الحفیظؒ اور ان کے رفقاء جامعہ صدیقیہ کراچی کے طالب علم محمد سفیرؒ،ڈیرہ اسماعیل خان میں خواجہ محمد زاہدؒ، شیخ ایازؒ، کوئٹہ بلوچستان میں میر مٹھا خان خٹک اور ان کے رفقاء اور دیگر مختلف سانحات میں جام شہادت نوش کرنے والے تمام علماء کرام کے وحشیانہ قتل عام کی شدید مذمت کرتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ علماء کرام اور دیگر شہداء کے قاتلوں کو فی

الفور گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دی جائے۔ یہ اجتماع تمام شہداء کے لئے دعائے مغفرت کے ساتھ ان کے جملہ پسماندگان اور عقیدت مندوں کے ساتھ تعزیت کا اظہار کرتا ہے۔

16- یہ اجتماع مختلف ایجنسیوں کی طرف سے دینی مدارس کے بے گناہ اساتذہ، طلباء اور کارکنوں کو ہراساں کرنے، اغواء کرنے اور بلا وجہ مقدمات قائم کرنے کی شدید مذمت کرتا ہے اور مقدمات ختم کرنے اور ان کی رہائی کا مطالبہ کرتا ہے۔

مجلہ / مقام / زیر اہتمام:

ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ

تاریخ اشاعت: مئی ۲۰۱۰ء

قومی وملی تحریکات میں اہل تشیع کی شمولیت (۱)

گزشتہ ایک ماہ کے دوران مجھے کراچی، بہاول پور، لاہور، راولپنڈی، خانیوال، کبیروالا، سرگودھا، نوشہرہ، پشاور اور دیگر شہروں میں مختلف دینی اجتماعات میں شرکت اور احباب سے ملاقاتوں کا موقع ملا اور اکثر اوقات میں دوستوں کے اس سوال کا سامنا کرنا پڑا کہ تحریک تحفظ ناموس رسالت کی مرکزی قیادت میں اہل تشیع کی شمولیت کے بارے میں آپ کا موقف اور رائے کیا ہے؟ میں نے گزارش کی کہ پاکستان شریعت کونسل کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت میں بھی تحریک تحفظ ناموس رسالت کی مرکزی کونسل کا حصہ ہوں اور اس حوالے سے میرا موقف وہی ہے جو ملک کے اکابر علماء کرام کا قیام پاکستان کے بعد سے مسلسل چلا آرہا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جب یہ سوال اٹھا کہ پاکستان میں نفاذِ اسلام کس فرقے کے مسلک اور فقہ کے مطابق ہوگا

اور اس سلسلہ میں فکری، کلامی اور فقہی اختلافات کو کیسے کنٹرول کیا جائے گا؟ اس سوال کے جواب کے لیے علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی سربراہی میں تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام نے متفقہ ۲۲ نکات پیش کر کے اس سوال اور اعتراض کا منہ بند کردیا اور بتایا کہ تمام تر اعتقادی اور فقہی اختلافات کے باوجود پاکستان میں آباد تمام مذہبی مکاتب فکر دستوری بنیاد اور قانونی نظام پر متفق ہیں اور ایک متفقہ دستوری ڈھانچہ انہوں نے پیش کردیا جس میں دیگر مکاتب فکر کے ساتھ اہل تشیع کے ذمہ دار علماء کرام بھی شریک تھے۔

۱۹۵۲ء میں تحریک ختم نبوت کے لیے تمام مکاتب فکر کو پھر سے جمع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور آل پارٹیز ایکشن کمیٹی قائم کی گئی تو اس میں بھی اہل تشیع کی نمائندگی موجود تھی جبکہ مولانا ابوالحسنات قادریؒ اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔

۱۹۷۴ء میں محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ کی قیادت میں کل جماعتی مجلس عمل تحفظ ختم نبوت تشکیل پائی اور اس کی جدوجہد سے قادیانیت کو پارلیمنٹ کو غیر مسلم اقلیت کا درجہ دلوایا تو اس کی قیادت میں بھی اہل تشیع موجود تھے۔

۱۹۷۷ء میں ملک میں نفاذ اسلام کے لیے تحریک نظام مصطفی کی جدوجہد حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی سربراہی میں میدان میں آئی اس کی قیادت میں بھی شیعہ راہ نما موجود تھے۔

۱۹۹۸ء میں حضرت مولانا خواجہ خان محمد نوراللہ مرقدہ کی سربراہی میں ایک بار پھر کل جماعتی مجلس عمل کا احیاء عمل میں لایا گیا تو اہل تشیع اس کی قیادت میں موجود تھی، بلکہ نائب صدر کے منصب پر ایک شیعہ راہ نما فائز تھے۔

اب جبکہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کی میزبانی اور امیر مجلس حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی دامت برکاتہم کی رہ نمائی میں تحریک تحفظ ناموس رسالت وجود میں آئی ہے تو ماضی کے اسی

تسلسل میں شیعہ رہنماؤں کو اس کی ہائی کمان میں شامل کیا گیا ہے۔ اس سے قبل متحدہ مجلس عمل میں بھی اہل تشیع کے دیگر مکاتب فکر کے ساتھ قیادت کا حصہ رہ چکے ہیں، اس طرح دینی تحریکات کے حوالے سے قیام پاکستان کے بعد سے اب تک جو روایت اور تسلسل چلا آرہا ہے، وہ بدستور قائم ہے اور یہ دراصل سیکولر حلقوں کے اس اعتراض یا الزام کا عملی جواب ہے کہ پاکستان کے اسلامی تشخص، ملک میں اسلام اور شریعت کی حکمرانی کے بارے میں ملک کے مذہبی مکاتب فکر پوری طرح متفق اور پاکستان میں نفاذ اسلام فرقہ وارانہ مسئلہ نہیں بلکہ متفقہ قومی مسئلہ ہے۔

ایک موقع پر بعض دوستوں نے یہ سوال کیا ہے کہ ہمارے والد محترم امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کا موقف اور طرز عمل کیا تھا؟ خصوصاً اس پس منظر میں کہ انہوں نے اثناء عشری اہل تشیع کی تکفیر پر ''ارشاد الشیعہ'' کے نام سے کتاب بھی لکھی ہے، میں نے گزارش کی کہ انہوں نے ''ارشاد الشیعہ''، تصنیف فرمائی اور اس میں انہوں نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ صرف ان کا موقف نہیں بلکہ یہ تو اہل سنت کا موقف ہے اور خود ہمارا موقف بھی اثنا عشری اہل تشیع کی حد تک یہی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ان تمام تحریکات کا حصہ رہے ہیں جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ اور عم محترم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ اور دیگر بزرگ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں شریک ہوئے ہیں، جلوسوں کی قیادت کی، مشترکہ اجتماعات میں شرکت کرتے رہے ہیں اور دونوں گرفتار بھی ہوئے ہیں۔ حضرت والد صاحبؒ کم وبیش دس ماہ، حضرت صوفی صاحبؒ نے تقریباً چھ ماہ اس تحریک میں جیل کاٹی ہے۔ ۷۴ء کی تحریک ختم نبوت میں دونوں حضرات سرگرمی کے ساتھ شریک ہوتے رہے، مشترکہ اجتماعات میں خطاب کرتے رہے ہیں اور جامعہ نصرۃ العلوم

گوجرانوالہ میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کی صدارت میں منعقد ہونے والا وہ تاریخی جلسہ تحریکی تاریخ کا حصہ ہے جس میں دوسرے مکاتب فکر کے اکابر علماء کرام کے علاوہ شیعہ راہ نماؤں نے بھی خطاب کیا تھا بلکہ یہ واقعہ بھی تاریخی اہمیت کا حاصل ہے کہ جلسہ کے بعد جب پولیس نے علامہ علی غضنفر کراروی کو جلسہ گاہ سے نکلتے ہی گرفتار کرلیا تو آغا شورش کاشمیری نے نہ صرف اپنے خطاب کے دوران شدید احتجاج کیا بلکہ پولیس چوکی کا لوگوں کے ہجوم کے ساتھ محاصرہ کرلیا اور کراروی صاحب کو رہا کرکے وہاں سے واپس ہوئے۔

۷۷ء کی تحریک نظام مصطفی میں گوجرانوالہ میں حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی نے مشترکہ عوامی جلوس کی قیادت کی اور گکھڑ میں حضرت والد محترم جلوسوں کی قیادت کرتے رہے اور ان کا یہ تاریخی واقعہ بھی اسی تحریک کا ہے کہ فیڈرل فورس کے کمانڈر نے اس کو روکنے کے لیے اس کے راستے میں لکیر کھینچ کر اعلان کیا کہ جو شخص اس لائن کو عبور کرے گا، اسے گولی ماردی جائے گی، یہ سن کر حضرت والد محترمؒ نے اپنے رفقاء استاذ محترم حضرت مولانا محمد انور صاحب مدظلہ اور حاجی سیدڈار صاحب مرحوم کے ہمراہ یہ کہہ کر کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے لائن کراس کی کہ ''مسنون عمر پوری کرچکا ہوں اور اب شہادت کی تمنا رکھتا ہوں۔'' ان کا یہ جذبہ دیکھ کر فیڈرل سیکورٹی فورس کی رائفلیں سرنگوں ہوگئیں اور جلوس پوری شان وشوکت کے ساتھ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ اپنی زندگی کے آخری دس سال وہ بستر علالت پر رہے، لیکن اس دوران متحدہ مجلس عمل تشکیل پائی تو انہوں نے دونوں الیکشنوں میں متحدہ مجلس عمل کے امیدواروں کی حمایت کی اور لوگوں کو ان کا ساتھ دینے کی تلقین فرمائی۔ بعض حضرات نے اس سلسلہ میں تحفظات کا بھی ان کے سامنے اظہار کیا، مگر ان کا موقف وہی رہا۔

میں نے دوستوں سے عرض کیا کہ کسی کو مسلمان، منافق یا کافر قرار دینے کا مسئلہ اپنی جگہ پر ایک دینی ضرورت ہوتی ہے، لیکن قومی ضروریات اور معاشرتی روابط ومعاملات کا ایک مستقل دائرہ ہوتا ہے اور ہمارے بزرگوں نے اپنی اپنی جگہ ان دونوں کا لحاظ رکھا ہے۔ حضرت والد محترمؒ اور حضرت صوفی صاحبؒ کا زندگی بھریہ معمول رہا ہے کہ وہ بہت سے معاملات پر اپنے تحفظات کا اظہار کرتے تھے اور رائے بھی دیتے تھے، لیکن جب کوئی اجتماعی فیصلہ ہوجاتا تھا تو اسے نہ صرف قبول کرلیتے تھے بلکہ اس کا بھرپور ساتھ دیتے تھے۔ خود میرا معمول بھی بحمداللہ تعالیٰ یہی ہے کہ بعض معاملات پر اپنی مستقل رائے رکھتا ہوں، اس کا اظہار بھی کرتا ہوں اور کوئی مناسب موقع ہوتو اس پر بحث ومباحثہ سے بھی گریز نہیں کرتا، لیکن عملاً وہی کرتا ہوں جو اجتماعی فیصلہ ہوتا ہے اور جمہور اہل علم کا موقف ہوتا ہے، رائے کے حق سے میں کبھی دست بردار نہیں ہوا، لیکن اپنی رائے کو حتمی قرار دے کر جمہور اہل علم کے موقف کے سامنے اڑنے سے ہمیشہ گریز کیا ہے اور اسے کبھی حق اور صواب کا راستہ نہیں سمجھا۔

میری طالب علمانہ رائے میں اسلام، کفر اور نفاق کی بحث کے باوجود معاشرتی معاملات اور اجتماعی روایات کو الگ دائرے میں رکھنا چاہیے اور اس سلسلہ میں دورنبویؐ میں ہمارے لیے مثال موجود ہے۔ عبداللہ بن اُبی اور اس کے منافق ساتھیوں کو جن کی تعداد غزوۂ احد کے موقع پر تین سو کے لگ بھگ بیان کی جاتی تھی، قرآن کریم کی نص قطعی میں ''کافر'' قرار دیا گیا ہے اور یہ اعلان کیا گیا ہے کہ ''وماھم بمؤمنین''، وہ مسلمان نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عبادات میں شریک ہوتے رہے ہیں، غزوات میں اپنی تمام تر غلط حرکات کے باوجود شامل ہوتے رہے ہیں۔ ان کے بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ انہیں قتل نہ کردیا جائے؟ تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ نے جواب دیا کہ

''نہیں ! اس سے یہ تاثر پھیلے گا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کردیتے ہیں''، اس لیے کہ دنیا کو وہ مسلمانوں کا حصہ ہی نظر آتے ہیں۔ حتیٰ کہ منافقین نے ایک موقع پر الگ مسجد بناکر خود کو عمومی معاشرے سے الگ کرنا چاہا تو قرآن کریم نے اسے ''مسجد ضرار'' قرار دیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں جانے سے منع کردیا۔ وہ مسجد گرادی گئی اور مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ منافقین کو ان کے کفر کے باوجود معاشرتی طور پر الگ ہونے سے روکا جائے کہ اس کے نقصانات زیادہ ہیں۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ اکابر کے فیصلوں پر حسب سابق اعتماد کیا جائے۔

راقم الحروف نے مختلف دوستوں کے سوالات پر تحریک تحفظ ناموس رسالت کی قیادت میں اہل تشیع کی شمولیت کے مسئلے پر اپنے موقف کی وضاحت کی تھی جو روزنامہ اسلام میں ۱۱؍ فروری ۲۰۱۱ء کو ''نوائے حق'' کے عنوان سے میرے مستقل کالم کی صورت میں شائع ہوئی۔ اس پر محترم جناب مولانا محمد یونس قاسمی نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے جو مذکورہ کالم کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ مولانا قاسمی کی شکایت یہ ہے کہ اکابر کے فیصلے بدلتے رہتے ہیں جبکہ میں نے اس کالم میں ہی اس کے بارے میں عرض کردیا تھا کہ کسی کو کافر قرار دینے یا مسلمان تسلیم کرنے کا دائرہ الگ ہے اور معاشرتی روابط اور مشترکہ تحریکات میں اشتراک عمل کا دائرہ اس سے مختلف ہے جس کی واضح مثال موجود ہے کہ دورِ نبوی میں عبد اللہ بن ابی اور اس کے ٹولے کو قرآن کریم کی نص قطعی میں کافر قرار دیے جانے کے باوجود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرتی طور پر انھیں الگ نہیں کیا بلکہ ان کی تمام تر خرابیوں اور غلط کاریوں کے ہوتے ہوئے بھی انھیں اجتماعی معاملات میں اپنے ساتھ شریک رکھا، اس لیے کہ انھیں معاشرتی طور پر

الگ کرنے اور ان کے خلاف کوئی سخت کارروائی کرنے میں اس دور کے حالات میں مصلحت نہیں تھی۔

ہمارے اکابر کا طریقہ بھی یہی چلا آرہا ہے کہ کفر کے فتووں کے باوجود مشترکہ قومی معاملات اور اجتماعی تحریکات میں اہل تشیع کو اپنے ساتھ شریک رکھا ہے اور اس میں کوئی تعارض اور الجھن کی بات نہیں ہے۔ اس سلسلے میں علماء کرام کے متفقہ ۲۲ نکات، ۵۳ء کی تحریک ختم نبوت، ۱۹۷۳ء کے دستور، ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت، ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفی اور ۱۹۸۴ء کی تحریک ختم نبوت کا حوالہ مذکورہ کالم میں دیا جا چکا ہے۔ اس کے ساتھ اس تسلسل میں چند اور تحریکات کا اضافہ بھی کرنا چاہتا ہوں۔

بھارت میں مسلمانوں کے شرعی خاندانی قوانین کے تحفظ کے لیے ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا مشترکہ پلیٹ فارم موجود ہے جس کے پہلے سربراہ حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ، دوسرے سربراہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، تیسرے سربراہ حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ تھے جبکہ اب اس کے سربراہ حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی مدظلہ ہیں اور اہل تشیع اس بورڈ کا نہ صرف مسلسل حصہ ہیں بلکہ ممتاز شیعہ علما اس کے مرکزی عہدہ دار بھی چلے آرہے ہیں۔

ایران میں اہل سنت کے بزرگ عالم دین حضرت مولانا عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ جو حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے تلامذہ میں سے تھے، ایرانی انقلاب کے بعد اس کی مرکزی کونسل اور دستور ساز اسمبلی کے ممبر رہے ہیں اور ایرانی دستور کی تشکیل میں ان کا اہم کردار ہے۔ حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی اور دوسرے علماء کرام کے ساتھ مجھے ۱۹۸۷ء میں ایران جانے کا موقع ملا تو ہم نے ایران میں حضرت مولانا عبد العزیز سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ انھوں نے ایرانی انقلاب اور دستور میں اپنے کردار کا تفصیل کے

ساتھ تذکرہ فرمایا، البتہ یہ شکایت کی کہ اب ایرانی راہ نماؤں کا رویہ تبدیل ہوتا جا رہا ہے اور وہ ان کی باتوں پر پہلے کی طرح توجہ نہیں دیتے۔

افغانستان میں روسی استعمار کے خلاف جہاد میں اہل سنت کی نصف درجن کے لگ بھگ جہادی تنظیموں کے ساتھ ساتھ اہل تشیع کی ''حزب وحدت'' بھی جہاد افغانستان کا حصہ رہی ہے اور ان تنظیموں کے درمیان اس دور میں اشتراک وتعاون بھی رہا ہے۔

دینی مدارس کے تحفظ کے لیے تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس کے وفاقوں کے اتحاد ''اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ'' میں وفاق المدارس الشیعہ شامل ہے جس کا ذکر محترم مولانا محمدیونس قاسمی نے بھی اپنے مضمون میں کیا ہے۔

اس لیے مولانا محمدیونس قاسمی صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ اصل الجھن انھیں صرف اس وجہ سے ہو رہی ہے کہ وہ دونوں الگ الگ دائروں میں فرق نہیں کر پا رہے۔ اگر اس فرق کو وہ سنجیدگی سے محسوس کر لیں تو انھیں اکابر کے طرز عمل میں نہ کوئی تضاد نظر آئے گا اور نہ ہی یہ شکایت ہوگی کہ بزرگوں نے پہلے فیصلوں کے بعد نیا فیصلہ کرنے میں متعلقہ دوستوں کو اعتماد میں نہیں لیا۔ اکابر کے فیصلے فتووں کے دائرے میں مسلسل وہی چلے آ رہے ہیں جو پہلے سے موجود ہیں اور معاشرتی روابط اور دینی تحریکات کے دائرے میں بھی ان کے فیصلوں کے تسلسل میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ صرف دائروں کے فرق کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد کسی دوست کے ذہن میں کوئی الجھن باقی نہیں رہے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مجلہ / مقام / زیر اہتمام:

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

تاریخ اشاعت: مارچ ۲۰۱۱ء

قومی وملی تحریکات میں اہل تشیع کی شمولیت (۲)

مذکورہ بالا عنوان پر مولانا محمد یونس قاسمی، حافظ عبد المنان معاویہ اور راقم الحروف کی گزارشات 'الشریعہ' کے مارچ اور اپریل کے شماروں میں قارئین کی نظر سے گزر چکی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ دونوں طرف سے ضروری باتیں سامنے آچکی ہیں اور اب کسی مزید بحث کی ضرورت باقی نہیں رہی، مگر مولانا محمد یونس قاسمی نے اپنے تازہ مضمون میں ایک دو باتیں ایسی فرمائی ہیں جن کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

انھوں نے راقم الحروف کے بارے میں فرمایا ہے کہ میں نے قرآن کریم کی کسی منسوخ آیت سے استدلال کیا ہے۔ حیرت کے ساتھ یہ بات پڑھنے کے بعد میں نے اس سلسلے کے اپنے مضامین پر پھر ایک نظر ڈالی ہے، اس لیے کہ میں نے تو اپنے مضامین میں قرآن کریم کی صرف ایک ہی آیت کریمہ کا حوالہ دیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''وماھم بمومنین''، وہ مومن نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور آیت کریمہ کا حوالہ میرے مضامین میں استدلال کے طور پر موجود نہیں ہے اور اس آیت کے منسوخ ہو جانے کا مجھے علم نہیں ہے۔ اگر اس کے منسوخ ہو جانے پر کوئی حوالہ موجود ہو تو میں اس سے باخبر ہونا چاہوں گا، خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ قرآن کریم کے اس جملے میں ان منافقین کے مومن نہ ہونے کی 'خبر'' دی گئی ہے جبکہ نسخ صرف احکام میں ہوتا ہے۔ ایمانیات اور اخبار نسخ کے دائرے کے امور نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے قرآن کریم کے حوالے سے ''مسجد ضرار'' کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے نسخ کی کوئی صورت بھی کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں نے اپنے سارے استدلال کی بنیاد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمومی طرز عمل اور معاشرتی رویے پر رکھی ہے کہ ان منافقین کے مومن نہ ہونے کے باوجود معاشرتی معاملات میں یہ لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلسل شریک رہے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں نہ صرف معاشرتی امور بلکہ مذہبی معاملات میں بھی اپنے ساتھ شریک رکھنے میں ہی مصلحت سمجھی ہے اور یہ سلسلہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں آخر تک رہا ہے۔ 'اخرج فانک منافق' قسم کا کوئی واقعہ اگر ہوا بھی ہے تو وہ شخصی واقعہ ہے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمومی رویے اور پالیسی کا آئینہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ طرز استدلال اہل حدیث حضرات کا ہے کہ کسی جزوی واقعہ یا ایک آدھ روایت کو بنیاد بنا کر پورے موقف کی عمارت کھڑی کر دیتے ہیں۔ احناف کا طرز استدلال اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے ہاں مجموعی صورت حال کو سامنے رکھا جاتا ہے، صحابہ کرام کے اجماعی تعامل کو دیکھا جاتا ہے اور تمام متعلقہ روایات جو میسر ہوں، ان کا جائزہ لے کر موقف طے کیا جاتا ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل ان منافقین کے بارے میں یہ تھا کہ چند معروف منافقین کے علاوہ صحابہ کرام کی صفوں میں موجود ان منافقین کی نشان دہی تک نہیں کی گئی۔ انھیں الگ کرنے اور معاشرتی طور پر انھیں علیحدہ قرار دینا تو بعد کی بات ہے۔ اس سے قبل ان کی جو نشان دہی ضروری قرار پاتی ہے، اس کا مرحلہ بھی نہیں آیا۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف چودہ منافقین کے نام بتائے اور وہ بھی صرف حضرت حذیفہ بن الیمان کو، اس شرط کے ساتھ کہ وہ ان میں سے کسی کا نام اور کسی کو نہیں بتائیں گے، حتیٰ کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے انھیں کئی بار کرید کر پوچھنا چاہا مگر حضرت حذیفہؓ نے امیر المومنین حضرت عمرؓ کو بھی

ان میں سے کسی منافق کا نام بتانے سے انکار کر دیا جس پر حضرت عمرؓ نے یہ طرز عمل اختیار کیا کہ کسی عام شخص کے جنازے پر اگر حضرت حذیفہؓ موجود ہوتے تو حضرت عمرؓ جنازہ پڑھتے تھے، ورنہ یہ سوچ کر جنازہ پڑھنے سے گریز کرتے تھے کہ یہ میت کہیں ان چودہ منافقین میں سے کسی کی نہ ہو۔
جہاں منافقین کے ناموں تک کو خفیہ رکھنے کا اس قدر اہتمام موجود تھا، وہاں معاشرتی طور پر انھیں الگ کر دینے اور ان کا بائیکاٹ کر دینے کی بات عملی طور پر کس طرح ممکن ہے؟
مولانا محمد یونس قاسمی کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ منافقین کے معاشرتی بائیکاٹ کی بات خود قرآن کریم نے ایک جگہ کی ہے جس کا ذکر سورۃ الفتح کی آیت ۱۵ میں ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جو منافقین جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں آئے تھے، ان سے کہا گیا کہ اگلی جنگ میں تم مسلمانوں کے ساتھ شریک نہیں ہو سکو گے، چنانچہ غزوۂ خیبر میں وہ لوگ خواہش کے باوجود مسلمانوں کے ساتھ نہیں جا سکے تھے، لیکن یہ مقاطعہ وقتی اور عارضی تھا، اس لیے کہ سورۃ الفتح کی اس سے اگلی آیت ۱۶ میں ان منافقین سے کہا گیا ہے کہ:
''تمھیں عنقریب ایک اور قوم کے مقابلے میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی جو بڑی سخت پکڑ والی قوم ہے۔ تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں گے۔ اگر تم اطاعت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمھیں اچھا اجر عطا کریں گے اور اگر تم پھر گئے جیسے تم اس سے پہلے پھر جاتے رہے ہو تو اللہ تعالیٰ تمھیں سخت عذاب سے دوچار کر دے گا۔''
مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ یہ سخت پکڑ والی قوم (اولی باس شدید) جس کے مقابلے کے لیے منافقین کو مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے کی قرآن کریم خود دعوت دے رہا ہے، مسیلمہ کذاب کی قوم تھی اور وہ قبیلے تھے جو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مرتد ہو گئے تھے، اس لیے یہ کہنا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری دور میں

منافقین کو مسجدوں سے نکال دیا تھا اور انھیں اپنی صفوں سے الگ کر دیا تھا، ایک خواہش تو ہو سکتی ہے مگر امر واقعہ نہیں ہے، حتیٰ کہ جب منافقین نے اپنی الگ مسجد بنا کر جداگانہ تشخص قائم کرنا چاہا تو قرآن کریم نے اسے ''مسجد ضرار'' قرار دے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں جانے سے منع کر دیا تھا اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ''مسجد ضرار'' کو گرا کر بلکہ نذر آتش کر کے ان کے علیحدہ تشخص کے امکان کو ہی ختم کر دیا تھا۔

میری طالب علمانہ رائے کے مطابق وہ منافقین جنھیں قرآن کریم نے صراحتاً 'وما ہم بمومنین' قرار دیا ہے اور وہ متذبذب اعرابی مسلمان جن کا قرآن کریم نے 'لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا' کے عنوان سے ذکر کیا ہے، ان کے بارے میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی پالیسی یہ رہی ہے کہ انھیں الگ تشخص قائم نہ کرنے دیا جائے، بلکہ انھیں اپنے ساتھ رکھ کر ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی سرگرمیوں پر پوری نظر رکھتے ہوئے ان کے شر سے بچنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ یہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی حکیمانہ پالیسی کا نتیجہ تھا کہ وہ منافقین جن کی تعداد غزوۂ احد کے موقع پر ایک ہزار میں سے تین سو بتائی جاتی ہے، اپنا الگ تشخص اور مورچہ قائم نہ کر سکنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ مسلم سوسائٹی میں تحلیل ہوتے چلے گئے اور جنگ یمامہ اور مرتدین کے خلاف جہاد کے بعد ان کا کوئی اکا دکا نشان بھی تاریخ کے تذکرے میں موجود نہیں ملتا۔

مولانا محمد یونس قاسمی نے ایک بار پھر فتووں کی بات چھیڑی ہے، جبکہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ معاملہ فتاویٰ کے دائرے کا نہیں بلکہ معاشرتی اور قومی ضروریات کے دائرے کا ہے۔ انھوں نے دار العلوم دیوبند کے فتویٰ کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہمیں اس فتوے سے پوری طرح اتفاق ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کے خاندانی شرعی قوانین کے تحفظ کے لیے ''آل انڈیا

مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے عنوان سے جو مشترکہ فورم کام کر رہا ہے اور اہل تشیع بھی اس کا حصہ ہیں، کیا دار العلوم دیوبند اس سے الگ تھلگ ہے؟ اس بورڈ کی تو بنیاد ہی حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قدس اللہ سرہ العزیز کی صدارت میں رکھی گئی تھی اور وہ تاحیات اس کے صدر رہے ہیں۔ اور کیا حرمین شریفین میں اہل تشیع کو مسلمانوں کے ساتھ نمازوں، روزوں، حج، تراویح اور دیگر عبادات میں شریک ہونے سے روکنے کے لیے کوئی قدم اٹھایا گیا ہے؟ جن چند بزرگوں نے مقاطعہ کی بات کی ہے، وہ بھی ہمارے بزرگ ہیں، اکابر ہیں اور قابل احترام ہیں، لیکن آج بھی علماء امت کا اجماعی تعامل کیا ہے؟ اور ہمارے مراکز کی عملی پالیسی کیا ہے؟ اگر ہم شخصی آرا اور اجماعی تعامل میں فرق محسوس کرتے ہوئے اپنے اندر معروضی حقائق اور ملی ضروریات کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کر سکیں تو اکابر کے عملی فیصلوں کی حکمتوں کو سمجھنا آج بھی مشکل نہیں ہے۔

مجلہ / مقام / زیر اہتمام:

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

تاریخ اشاعت: مئی ۲۰۱۱ء

مشترکہ دینی تحریکات اور حضرت امام اہل سنتؒ

تحریک ختم نبوت، تحریک تحفظ ناموس رسالت اور تحریک نفاذ شریعت کے لیے مشترکہ دینی تحریکات میں اہل تشیع کی شمولیت پر ہمارے بعض دوستوں کو اعتراض ہے۔ یہ اعتراض ان کا حق ہے اور اس کے لیے کسی بھی سطح پر کام کرنا بھی ان کا حق ہے۔ اسی طرح اعتراض کو قبول نہ کرنا ہمارا بھی حق ہے جس کے بارے میں ہم نے مختلف مواقع پر اپنے موقف کا تفصیل کے ساتھ اظہار کیا ہے اور ضرورت کے مطابق آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

اس سلسلے میں ہمارے والد گرامی امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ کا نام کثرت سے استعمال کیا جا رہا ہے جو محل نظر ہے اور اس حوالے سے حضرت امام اہل سنتؒ کی زندگی کے چند اہم مراحل کی طرف توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے:

قیام پاکستان سے قبل حضرت امام اہل سنتؒ مجلس احرار اسلام کے باقاعدہ کارکن رہے ہیں اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اس دور میں آل انڈیا مجلس احرار اسلام کے سیکرٹری جنرل معروف شیعہ عالم دین مولانا مظہر علی اظہر تھے۔

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں حضرت امام اہل سنتؒ شریک رہے ہیں اور متعدد جلوسوں کی قیادت کی ہے بلکہ از خود گرفتاری دے کر کم وبیش نو ماہ جیل میں رہے ہیں۔ اس تحریک کی قیادت میں اہل تشیع شریک تھے۔

۱۹۵۱ء میں علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی صدارت میں تمام مکاتب فکر کے اکابر ۳۱، علماء کرام کے طے کردہ ۲۲ متفقہ دستوری نکات کی حضرت امام اہل سنت نے ہمیشہ حمایت کی

ہے اور وہ ملک میں ان کے نفاذ کا مسلسل مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ ان ۲۲ نکات کی ترتیب وتدوین میں بھی اکابر شیعہ علما شریک تھے۔

۷۷ء میں نظام مصطفی کے نفاذ کی تحریک میں حضرت امام اہل سنت نے بھرپور کردار ادا کردار ادا کیا ہے، عوامی جلوسوں کی قیادت کرتے رہے ہیں اور ایک جلوس کی قیادت کر کے از خود گرفتاری پیش کی ہے جس کے نتیجے میں وہ اپنے فرزند مولانا عبد الحق خان بشیر کے ہمراہ ایک ماہ تک ڈسٹرکٹ جیل گوجرانوالہ میں قید رہے ہیں۔ اس تحریک کی قیادت میں بھی اہل تشیع شریک تھے۔

۷۴ء کی تحریک ختم نبوت میں امام اہل سنتؒ نے حضرت السید مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی قیادت میں بھرپور کردار ادا کیا ہے اور اس تحریک کی مرکزی مجلس عمل میں اہل تشیع شریک تھے۔

مشترکہ دینی وسیاسی تحریکات میں جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کی شمولیت کے مسئلہ پر اختلاف کے باعث حضرت مولانا قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت مولانا عبد اللطیف جہلمیؒ اور ان کے رفقا نے جمعیۃ سے الگ ہو کر جب تحریک خدام اہل سنت قائم کی تو حضرت امام اہل سنت نے اپنے ان بزرگ دوستوں کے تمام تر احترام اور ان کی دینی خدمات کے بھرپور اعتراف کے باوجود ان کا ساتھ نہیں دیا اور اس کے بعد بھی جمعیۃ علماء اسلام کے پلیٹ فارم پر مشترکہ دینی تحریکات میں انھوں نے ہمیشہ حصہ لیا ہے۔

حضرت امام اہل سنتؒ کی علالت کے دور میں جب متحدہ مجلس عمل تشکیل پائی تو انھوں نے عام انتخابات میں متحدہ مجلس عمل کی کھل کر حمایت کی اور اپنے ساتھیوں کو اس میں کام کرنے کی ہدایت کی، جبکہ متحدہ مجلس عمل کی قیادت میں اہل تشیع موجود تھے اور اپنے حلقہ سے حضرت امام اہل سنتؒ نے قومی اسمبلی کے لیے متحدہ مجلس عمل کے جس امیدوار جناب قدرت اللہ

بٹ کی حمایت کی، ان کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے بلکہ وہ اس وقت جماعت اسلامی ضلع گوجرانوالہ کے امیر تھے۔

متحدہ مجلس عمل کے قیام کی تائید اور حمایت اس حوالے سے بطور خاص قابل توجہ ہے کہ بعض حضرات یہ استدلال پیش کر رہے ہیں کہ حضرت امام اہل سنت نے ''ارشاد الشیعہ'' تصنیف کر کے دینی تحریکات میں اہل تشیع کی شمولیت کے حوالے سے اپنے سابقہ موقف سے رجوع کر لیا تھا، حالانکہ ارشاد الشیعہ کا سن تصنیف ۱۹۸۷ء ہے جبکہ متحدہ مجلس عمل کا قیام ان کی عمر کے آخری دور میں جنرل پرویز مشرف کے زمانے میں ہوا تھا۔

مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں اپنے ان دوستوں سے میری گزارش ہے کہ وہ دینی تحریکات میں اہل تشیع کی شمولیت پر اپنے اعتراض کا حق ضرور استعمال کریں اور اس کے لیے جائز حدود میں مہم بھی چلائیں، لیکن مشترکہ دینی تحریکات کی حد تک اس سلسلے میں امام اہل سنتؒ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کا نام استعمال نہ کریں، اس لیے کہ امام اہل سنتؒ خود زندگی بھر ایسی تحریکات کا حصہ رہے ہیں۔

مجلہ/مقام/زیراہتمام:

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

تاریخ اشاعت:

نومبر ۲۰۱۱ء

نفاذ اسلام کی تحریکوں کا طریق کار

پاکستان شریعت کونسل ایک فکری و علمی فورم ہے جس میں نفاذ شریعت کے شعبے میں انتخابی سیاست سے ہٹ کر فکری و نظریاتی حوالے سے باہمی تبادلہ خیالات ہوتا ہے اور جو بات سمجھ میں آئے، اس کا علمی و عوامی حلقوں میں جب موقع ملے، اظہار کر دیا جاتا ہے۔ اس بار مدرسہ تعلیم القرآن، لنگرکسی بھوربن، مری میں امیر مرکزیہ مولانا فداء الرحمن درخواستی کی زیر صدارت ۱۶، ۱۷ جون ۲۰۱۲ء کو منعقد ہونے والے دو روزہ اجلاس میں مختلف مسائل زیر بحث آئے جن میں دو امور زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اور ان پر ہونے والی بحث کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

پہلا مسئلہ تو مسلم ممالک میں نفاذ اسلام کی تحریکوں کے طریق کار کے بارے میں ہے اور دوسرا پاکستان میں قومی اداروں میں جاری کشمکش کا ہے جس کا سنجیدگی سے جائزہ لیا گیا اور ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام نے باہمی مشاورت کے ساتھ ان پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

مسلم ممالک میں نفاذِ اسلام کی تحریکوں کو ایک عرصے سے اس صورت حال کا سامنا ہے کہ جو تحریکیں عسکری انداز میں ہتھیار اٹھا کر نفاذِ شریعت کا پروگرام رکھتی ہیں، انہیں نہ صرف اپنے ملک کی فوجی قوت کا سامنا ہے بلکہ عالمی سطح پر انہیں دہشت گرد قرار دے کر ان کے خلاف کردار کشی کی مہم چلائی جاتی ہے اور ایک طرح سے پوری دنیا ان کے خلاف یک آواز ہو جاتی ہے، جبکہ دوسری طرف وہ تحریکیں ہیں جو سیاسی انداز میں نفاذِ اسلام کے مقصد کی طرف آگے بڑھتی ہیں، جمہوری راستہ اختیار کرتی ہیں، رائے عامہ اور ووٹ کو ذریعہ بناتی ہیں اور عدمِ تشدد

کے اصول پر پُر امن سیاسی جدوجہد کرتی ہیں۔ ان کی عوامی ، سیاسی اور جمہوری جدوجہد کے نتائج کو مسترد کر دیا جاتا ہے اور مقتدر قوتیں مختلف حیلوں سے ان کے مقابل آکر ان کا راستہ روک دیتی ہیں۔ ایک عرصے سے یہ کھیل جاری ہے جس کی وجہ سے سیاسی اور جمہوری عمل پر سے اعتماد اٹھتا جا رہا ہے اور ان حلقوں کو تقویت مل رہی ہے جو نفاذ اسلام کے لیے سیاسی اور جمہوری جدوجہد کو کارِ لاحاصل سمجھتے ہیں اور عسکری جدوجہد کو نفاذ شریعت کا واحد جائز طریق کار قرار دے کر اس کے لیے مسلسل محنت بلکہ پیش رفت کر رہے ہیں۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم نے قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک نفاذِ اسلام کے لیے پُر امن سیاسی اور جمہوری جدوجہد کو ہی صحیح سمجھا ہے، ہمیشہ اسی کی حمایت کی ہے اور اب بھی پاکستان یا کسی بھی مسلم ممالک کے اندر نفاذِ اسلام کے لیے ہتھیار اٹھانے کو ہم درست عمل نہیں سمجھتے۔ لیکن جمہوری اور سیاسی عمل کے جمہوری اور سیاسی نتائج کو جس بے دردی کے ساتھ کچلا جا رہا ہے، اس کے باعث ہمارے لیے اب سیاسی اور جمہوری عمل کی حمایت اور دفاع مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ دو عشرے قبل الجزائر میں دینی جماعتوں کے اتحاد اسلامک سالویشن فرنٹ نے عوامی انتخابات کے پہلے مرحلے میں مبینہ طور پر ۸۰ فی صد ووٹ حاصل کیے تو فوج سامنے آگئی، الیکشن کے نتائج کو مسترد کر دیا گیا اور دوسرے مرحلے کو منسوخ کر دیا گیا جس کے رد عمل میں بہت سے مذہبی حلقوں نے ہتھیار اٹھا لیے۔ اس ہتھیار اٹھانے کے مسئلے پر ان کے درمیان بھی اختلافات پیدا ہوگئے یا کر دیے گئے، ملک میں تکفیر یعنی ایک دوسرے کو کافر قرار دینے اور باہمی قتل و قتال کا بازار گرم ہوگیا جو کم و بیش دس سال جاری رہا اور اس میں مجموعی طور پر ایک لاکھ کے لگ بھگ افراد قتل ہوئے۔

گزشتہ دنوں کویت میں عام انتخابات کے دوران دینی جماعتوں کے اتحاد نے عوامی ووٹوں کے ذریعے پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کی اور پارلیمنٹ کے ذریعے قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دیا گیا تو اسے بادشاہت کے اختیار سے مسترد کر دیا گیا، جبکہ مصر کی قومی اسمبلی میں اخوان المسلمین اور سلفی جماعتوں نے اکثریت حاصل کی تو سپریم کورٹ نے انتخابات کو غیر قانونی قرار دے کر عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والی قومی اسمبلی کو تحلیل کر دیا۔ ادھر پاکستان کی صورت حال یہ ہے کہ دستوری طور پر قرآن و سنت کی بالادستی تسلیم کی گئی ہے، پارلیمنٹ کو قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی کا پابند قرار دیا گیا اور اسلام کو ریاستی مذہب تسلیم کیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود قرآن و سنت کے احکام و قوانین کو ملک میں نفاذ کا راستہ نہیں دیا جا رہا اور مقتدر قوتیں نہ صرف متحد ہو کر نفاذِ اسلام میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں بلکہ جو چند قوانین عوامی دباؤ کے باعث نافذ کرنا پڑے ہیں، حیلوں بہانوں سے انہیں بھی منسوخ یا کم از کم غیر موثر بنانے کی مہم ہر وقت جاری رہتی ہے۔

پاکستان شریعت کونسل کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں اس بات کو محسوس کیا گیا کہ پاکستان کے مقتدر حلقوں کا ایجنڈا بھی (خاکم بدہن) یہی نظر آرہا ہے کہ نفاذِ اسلام کے جمہوری اور سیاسی راستوں کو مسدود کر کے ان کا اعتماد ختم کیا جائے اور الجزائر کی طرح پاکستان کے دینی حلقوں کو بھی تشدد، تکفیر اور خانہ جنگی کی دلدل کی طرف زبردستی دھکیلا جائے تاکہ الجزائر والا کھیل پاکستان میں بھی کھیلا جا سکے۔ اس لیے پاکستان شریعت کونسل نے اس صورت حال کو انتہائی تشویشناک اور اضطراب انگیز قرار دیتے ہوئے ملک کے تمام مکاتب فکر کے علمی حلقوں، دینی مراکز اور سیاسی قیادت سے اپیل کی ہے کہ وہ مستقبل کے ان خطرات و خدشات کے سدباب کے لیے باہمی مشاورت کے ساتھ قوم کی علمی و فکری رہنمائی کا اہتمام کریں۔

پاکستان میں داخلی طور پر قومی اداروں کے درمیان جاری کشمکش کے بارے میں پاکستان شریعت کونسل کی رائے ہے کہ یہ دستورِ پاکستان میں قرآن و سنت کی بالادستی کو عملاً نظر انداز کر دینے کا منطقی نتیجہ ہے کہ دستور نے جس کو بالادست اور بالاتر قرار دیا ہے، اس کی بالادستی کے سامنے سرنڈر ہونے کی بجائے قومی ادارے ایک دوسرے پر اپنی بالادستی قائم کرنے کی فکر میں الجھے ہوئے ہیں۔ اگر قیامِ پاکستان کے بعد سے ہی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ اور قرآن و سنت کی بالادستی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے قومی پالیسیوں کو اس دائرے میں مرتب کیا جاتا، خلفائے راشدین کے طرزِ حکومت کو اپنایا جاتا اور معاشرت و معیشت کی اسلامی روایات کو فروغ دیا جاتا تو نہ کرپشن کا عفریت کھڑا ہوتا، نہ طبقاتی کشمکش اور گروہی بالادستی کی جنگ کا مکروہ منظر دکھائی دیتا اور نہ ہی قومی اداروں میں بالاتری کی یہ کشمکش سامنے آتی۔ یہ سب کچھ پاکستان کے نظریاتی بنیادوں، اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ اور قرآن و سنت کی بالادستی سے انحراف اور روگردانی کا نتیجہ ہے اور آج بھی اس دلدل سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ قرآن و سنت کی بالادستی کو عملاً تسلیم کیا جائے اور خلافتِ راشدہ کی طرز کی فلاحی ریاست کو اپنی منزل قرار دے کر خلفائے راشدینؓ کے طرزِ حکومت کو اپنایا جائے۔

مجلہ / مقام / زیر اہتمام:

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

تاریخ اشاعت:

اگست ۲۰۱۲ء

اسلامی نظام کی جدوجہد اور اس کی حکمت عملی

ہمارے ہاں پاکستان کی معروضی صورت حال میں نفاذِ اسلام کے حوالہ سے دو ذہن پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ سیاسی عمل اور پارلیمانی قوت کے ذریعہ اسلام نافذ ہو جائے گا، اور دوسرا یہ کہ ہتھیار اٹھائے بغیر اور مقتدر قوتوں سے جنگ لڑے بغیر اسلام کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔ ایک طرف صرف پارلیمانی قوت پر انحصار کیا جا رہا ہے جبکہ دوسری طرف ہتھیار اٹھا کر عسکری قوت کے ذریعہ مقتدر قوتوں سے جنگ لڑنے کو ضروری قرار دیا جا رہا ہے۔ میری طالب علمانہ رائے میں یہ دونوں طریقے ٹھیک نہیں ہیں۔ صرف الیکشن، جمہوریت اور پارلیمانی قوت کے ذریعہ نفاذ اسلام اس ملک میں موجودہ حالات میں ممکن نہیں ہے اور ہتھیار اٹھا کر حکمران طبقات کے ساتھ جنگ کرنا اس کے شرعی جواز یا عدم جواز کی بحث سے قطع نظر بھی عملاً موثر اور نتیجہ خیز نہیں ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ ہے کہ کسی مسلم ریاست میں مسلمان حکمرانوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی شرائط فقہاء کرامؒ نے کیا بیان کی ہیں اور خاص طور پر جمہور فقہائے احناف کا موقف اس سلسلہ میں کیا ہے۔ لیکن اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیا عسکری گروپوں کے لیے ملک کی فوج اور اسٹیبلشمنٹ سے جنگ لڑ کر کوئی علاقہ حاصل کر لینا اور اس پر قبضہ برقرار رکھ کر اس میں کوئی نظام نافذ کر لینا ممکن بھی ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ہوش مند شخص اس سوال کا جواب اثبات میں دے گا، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس سلسلہ میں جدوجہد کے طریق کار کی حد تک ایران کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ایران کی مذہبی قیادت نے شاہ ایران کی قیادت سے انحراف کر کے یونیورسٹیوں اور کالجوں کو ذہن سازی اور فکری بیداری کی جولانگاہ بنایا، مسلسل سترہ برس تک محنت کے ذریعے اگلی نسل کو اس کے لیے تیار کر

کے اسے اپنی قوت بنایا اور اس قوت کے ذریعہ ہتھیار اٹھائے بغیر سٹریٹ پاور اور تحریکی قوت کے نتیجے میں شاہ ایران کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

میں ایرانیوں کے مذہب کی نہیں بلکہ ان کی جدوجہد کے طریق کار کی بات کر رہا ہوں کہ ان کے کامیاب تجربہ کو سامنے رکھ کر کیا ہم اپنی جدوجہد کا طریق کار طے نہیں کر سکتے؟ اگر کچھ دوستوں کو یہ حوالہ میرے قلم سے پسند نہ آرہا ہو تو میں امریکہ کے سیاہ فاموں کی اس جدوجہد کا حوالہ دینا چاہوں گا جو اب سے صرف پون صدی قبل کالوں کو گوروں کے برابر شہری حقوق دلوانے کے لیے منظم کی گئی تھی، ایک مذہبی لیڈر مارٹن لوتھر کنگ نے سیاہ فاموں کی سٹریٹ پاور کو کو منظم کیا، پُر امن احتجاجی تحریک کو آگے بڑھایا اور صرف دو عشروں میں ایک گولی چلائے بغیر ۱۹۶۴ء میں اس وقت کے امریکی صدر جان ایف کینیڈی سے سیاہ فام آبادی کے لیے سفید فاموں کے برابر شہری حقوق کی دستاویز پر دستخط کرانے میں کامیاب ہوگیا۔

میں نے دونوں تحریکوں کا مطالعہ کیا ہے، دونوں کے کے مراکز میں گیا ہوں، ان کے راہ نماؤں سے ملاقاتیں کی ہیں اور ان کی جدوجہد کے مختلف مراحل سے واقف ہوں، میں افغانستان بھی گیا ہوں، بار بار گیا ہوں، روسی استعمار کے خلاف جہاد میں مختلف جنگی محاذوں پر حاضری دی ہے، افغان مجاہدین کی روسی استعمار کے خلاف جنگ کو جہاد سمجھ کر اس میں شریک ہوا ہوں، امریکی استعمار کے خلاف ان کی جنگ کو بھی جہاد سمجھتا ہوں اور حتی الوسع اسے سپورٹ کرتا ہوں، لیکن پورے شرح صدر اور دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ دینی تصلب اور حمیت و غیرت میں تو بلاشبہ افغان مجاہدین اور افغان طالبان ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں لیکن نفاذ اسلام کی جدوجہد کے طریق کار کے حوالہ سے ہمیں ایران کی مذہبی تحریک کا مطالعہ کرنا ہوگا اور مارٹن لوتھر کنگ کی تحریک سے واقفیت حاصل کرنا ہوگی۔ اگر پُر امن عوامی تحریک اور رائے عامہ کی

منظم قوت کے ذریعہ ''امامت''کو دستوری شکل دے کر اسے نافذ کیا جا سکتا ہے تو ''خلافت'' کے احیاء و قیام کے لیے یہ قوت آخر کیوں کام میں نہیں لائی جا سکتی؟

مجلہ/مقام/زیراہتمام:

ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ

تاریخ اشاعت: فروری ۲۰۱۳ء

ہماری دینی تحریکات کی ناکامی کے اسباب

ہماری دینی تحریکات اس وقت مدّو جزر کے جس دور سے گزر رہی ہیں، ان کے مثبت اور منفی پہلوؤں کے حوالہ سے کچھ عرض کرنے کو جی چاہ رہا ہے، لیکن اس سے پہلے ربع صدی قبل کے ایک قومی کنونشن کی رپورٹ اور اٹھارہ سال قبل کے ایک بین الاقوامی سیمینار کی رپورٹ قارئین کی نذر کرنا چاہوں گا۔ اس گزارش کے ساتھ کہ ان دونوں رپورٹوں کو توجہ کے ساتھ ملاحظہ فرمایا جائے تاکہ جو معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں ان کا پس منظر سب کے سامنے ہو۔ (راشدی)

رپورٹ 1: آل پارٹیز قومی سنی کنونشن

پہلی رپورٹ ۱۰-۱۱ جنوری ۱۹۸۸ء کو شیرانوالہ گیٹ لاہور میں منعقد ہونے والے قومی سنی کنونشن کی ہے جو ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور میں انہی دنوں شائع ہوئی تھی۔

ملک میں اہل سنت کے خلاف فرقہ وارانہ دہشت گردی، علمائے اہل سنت کے خلاف جھوٹے مقدمات اور گرفتاریوں اور مختلف شہروں میں ایک درجن سے زائد سنی کارکنوں کی المناک شہادت سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کرنے کے لیے جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کی دعوت پر ۱۰-۱۱ جنوری کو لاہور میں ''قومی سنی کنونشن'' منعقد ہوا جس میں ملک کی اہم دینی تنظیموں اور سرکردہ شخصیات نے شرکت فرمائی۔ کنونشن میں شریک ہونے والی جماعتوں کے نمائندوں اور دیگر شخصیات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان: حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی، حضرت مولانا محمد اجمل خان، حضرت مولانا سمیع الحق، مولانا میاں محمد اجمل قادری، مولانا زاہد الراشدی، مولانا فداء الرحمن درخواستی، مولانا علاء الدین، مولانا قاضی عبد اللطیف، مولانا بشیر احمد شاد، مولانا حمید اللہ جان، مولانا سیف الرحمن، علامہ ڈاکٹر خالد محمود اور دیگر اہم شخصیات۔

سواد اعظم اہل سنت پاکستان: حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن، حضرت مولانا سلیم اللہ خان، حضرت مولانا اسفندیار خان، مولانا محمد جمیل خان اور دیگر حضرات۔

جمعیۃ اشاعت التوحید والسنہ پاکستان: حضرت مولانا قاضی احسان الحق، حضرت مولانا قاضی عصمت اللہ، مولانا حافظ محمد صدیق۔

تنظیم اہل سنت پاکستان: حضرت مولانا عبد الستار تونسوی، مولانا قاضی عبد اللطیف شجاع آبادی، مولانا محمد اسماعیل۔

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت: مولانا عزیز الرحمن جالندھری، مولانا نذیر احمد بلوچ، مولانا محمد اشرف ہمدانی، مولانا ضیاء الدین آزاد۔

مجلس تحفظ حقوق اہل سنت پاکستان: حضرت مولانا عبد الحئی جام پوری، مولانا سید عبد المجید ندیم، مولانا عبد الباقی۔

تحریک خدام اہل سنت پاکستان: مولانا مفتی محمد شریف عابد، حافظ عبد الوحید حنفی، مولانا شیر محمد، مولانا حافظ محمد طیب۔

انجمن سپاہ صحابہؓ پاکستان: مولانا ضیاء الرحمن فاروقی، قاری ایثار احمد قاسمی، قاری محمد منور۔

آل جموں و کشمیر جمعیۃ علماء اسلام: مولانا قاری سعید الرحمن تنویر، مولانا مفتی محمد یونس میر پوری، مولانا مفتی عبد الشکور کشمیری۔

انجمن اتحاد قبائل اہل سنت کوہاٹ: مولانا شیر محمد، حاجی جاوید پراچہ، کرنل سلطان علی شاہ، میجر حکم خان اور دیگر حضرات۔

مجلس علماء اہل سنت پاکستان: مولانا عبد الحق مجاہد اور ان کے رفقاء۔

مرکزی تحریک احیائے سنت پاکستان: جناب غلام رسول، مولانا محمد نواز بلوچ اور دیگر رفقاء۔

جمعیۃ طلباء اسلام پاکستان: میاں انور علی دہلوی، خالد محمود وٹو، محمد اکبر، حافظ سمیع اللہ اور ان کے رفقاء۔

ممتاز شخصیات

مولانا محمد ضیاء القاسمی، مولانا قاضی چن پیر الہاشمی حویلیاں، مولانا عبد المجید کہروڑپکا، مولانا محمد حنیف جالندھری ملتان، قاری نور الحق قریشی ایڈووکیٹ، مولانا مفتی محمد انور شاہ ملتان، میاں محمد عارف ایڈووکیٹ گوجرانوالہ۔ ان سرکردہ شخصیات کے علاوہ ملک کے چاروں صوبوں اور آزاد کشمیر سے کم وبیش تین سو سے زائد حضرات نے ''قومی سنی کنونشن'' میں شرکت کی۔

سربراہی اجلاس

پروگرام کے مطابق ۱۰ جنوری کو بعد نماز عشاء مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور میں کنونشن میں شرکت کرنے والے وفود کے سربراہوں کا اجلاس حضرت مولانا محمد اجمل خان نائب امیر اول جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں طویل بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ اس سلسلہ میں پہلے سے قائم شدہ ''متحدہ سنی محاذ پاکستان'' کو از سرِ نو منظم و متحرک بنایا جائے اور ملک کی ممتاز علمی شخصیت مولانا مفتی احمد الرحمن صاحب مہتمم جامعۃ العلوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کو اس کا امیر مقرر کیا جائے۔ حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن نے مسلسل انکار اور معذرت کے بعد بالآخر ہاؤس کے اس متفقہ فیصلہ کو قبول فرما لیا۔

اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ محاذ میں شامل تمام جماعتوں کے سربراہوں سمیت دو دو نمائندوں پر مشتمل ''سپریم کونسل'' قائم کی جائے جو متحدہ سنی محاذ کے پورے نظام کو کنٹرول کرے۔ اس کے علاوہ ملک کی اہم دینی شخصیات کو امیر مرکزیہ اپنی صوابدید پر سپریم کونسل کا رکن نامزد کریں گے۔ اجلاس میں مولانا زاہد الراشدی کو ''متحدہ سنی محاذ'' کا رابطہ سیکرٹری مقرر کیا گیا۔

اجلاس میں علامہ خالد محمود، مولانا محمد حنیف جالندھری، مولانا ضیاء الرحمن فاروقی، جاوید ابراہیم پراچہ، مولانا محمد جمیل خان اور مولانا عبد الرشید انصاری پر مشتمل پروگرام و قرارداد کمیٹی قائم کی گئی اور طے پایا کہ صبح ۱۱ جنوری کو ''قومی سنی کنونشن'' کی عمومی نشست سے قبل سپریم کونسل کا اجلاس ہوگا جس میں ''پروگرام و قرارداد کمیٹی'' آئندہ لائحہ عمل اور قراردادوں کے بارے میں تجاویز پیش کرے گی۔

سپریم کونسل کا اجلاس

۱۱ جنوری کو صبح ۹ بجے مدرسہ قاسم العلوم میں سپریم کونسل کا اجلاس امیر مرکزیہ مولانا مفتی احمد الرحمن کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں ''قرارداد کمیٹی'' کی تجاویز کی روشنی میں مندرجہ ذیل اہم فیصلے کیے گئے:

حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی، حضرت مولانا خان محمد کندیاں شریف اور حضرت مولانا عبد الستار تونسوی متحدہ سنی محاذ کے سرپرست اور مولانا محمد حنیف جالندھری ڈپٹی رابطہ سیکرٹری ہوں گے۔

چاروں صوبوں میں متحدہ سنی محاذ کے صوبای کنونشن منعقد ہوں گے۔ اس سلسلہ میں پہلا صوبائی کنونشن ۷ فروری کو فیصل آباد میں ہوگا۔ باقی کنونشنوں کی تاریخوں کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

۱۹ فروری کو کراچی میں عظیم الشان سنی کانفرنس ہوگی۔ اس سے قبل ۱۸ فروری کو کراچی میں سپریم کونسل کا اجلاس ہوگا جس میں آئندہ جدوجہد کا لائحہ عمل طے کیا جائے گا۔

امیر مرکزیہ محاذ کا دستور مرتب کرنے کے لیے کمیٹی نامزد کریں گے۔ یہ کمیٹی اپنی رپورٹ ۱۸ فروری کو کراچی میں سپریم کونسل کے اجلاس میں پیش کرے گی۔

اہل سنت کے ساتھ اب تک سرکاری و غیر سرکاری سطح پر ہونے والی زیادتیوں کے بارے میں مصدقہ اور دستاویز معلومات پر مشتمل قرطاس ابیض شائع کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں امیر مرکزیہ ایک کمیٹی مقرر کریں گے۔

ملک بھر میں اہل سنت کے علماء اور کارکنوں کے خلاف درج مقدمات اور ماتمی جلوسوں کے تنازعات کی قانونی حیثیت کا جائزہ لینے کے لیے ۱۸ فروری کے اجلاس میں ممتاز وکلاء پر مشتمل قانونی کمیٹی مقرر کی جائے گی۔

جن شہروں میں اہل سنت کے علماء اور کارکنوں کے خلاف مقدمات درج ہیں یا سنی کارکن شہید ہوئے ہیں وہاں متحدہ سنی محاذ کے مرکزی راہ نماؤں کا وفد جائے گا اور تازہ صورت حال کا جائزہ لینے کے علاوہ اس سلسلہ میں جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کرے گا۔

جو جماعتیں یا حلقے ''قومی سنی کنونشن'' میں شریک نہیں ہوئے ان سے دوبارہ رابطہ قائم کر کے انہیں اس جدوجہد میں شمولیت کے لیے آمادہ کیا جائے گا۔

کنونشن کی عمومی نشست

ساڑھے ۱۰ بجے ''قومی سنی کنونشن'' کی عمومی نشست کا آغاز جامع مسجد شیرانوالہ گیٹ کے بڑے حال میں ہوا جس کی صدارت امیر مرکزیہ مولانا مفتی احمد الرحمن نے کی۔ یہ نشست ۲ بجے تک جاری رہی اور اس سے حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستی، حضرت مولانا علامہ عبد الستار تونسوی، مولانا اسفندیار خان، مولانا سید عبد المجید ندیم، مولانا قاضی احسان الحق، مولانا سمیع الحق، علامہ خالد محمود، مولانا محمد اجمل خان، مولانا میاں محمد اجمل قادری، شیخ عزیز الرحمن، مولانا بشیر احمد شاد، جاوید ابراہیم پراچہ، مولانا محمد حنیف جالندھری، قاری نور الحق قریشی ایڈووکیٹ، قاری ایثار احمد قاسمی اور دیگر سرکردہ زعماء نے خطاب کیا جبکہ مولانا زاہد الراشدی نے سربراہی اجلاس اور سپریم کونسل کے فیصلوں کی رپورٹ پیش کی جسے کنونشن کے شرکاء نے

متفقہ طور پر منظور کر لیا۔ تمام مقررین نے کنونشن کے فیصلوں پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

قائد جمعیۃ علماء اسلام مولانا سمیع الحق اور صدر مجلس استقبالیہ مولانا میاں محمد اجمل قادری نے ''قومی سنی کنونشن'' کے شرکاء کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا اور اعلان کیا کہ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان ''متحدہ سنی محاذ'' کی رکن جماعت کی حیثیت سے محاذ کے فیصلوں پر عملدرآمد میں بھرپور کردار ادا کرے گی۔

حضرت الامیر مولانا محمد عبد اللہ درخواستی دامت برکاتہم نے کنونشن میں افتتاحی خطاب کرتے ہوئے دینی جماعتوں کے اس اتحاد و اشتراک پر بے حد مسرت کا اظہار فرمایا اور دعاء سے قبل مولانا عبد الستار تونسوی، مولانا مفتی احمد الرحمن، مولانا محمد اجمل خان، مولانا سمیع الحق، مولانا اسفندیار خان، مولانا میاں محمد اجمل قادری، قاری ایثار احمد قاسمی، مولانا شیر محمد آف کوہاٹ اور دیگر حضرات کی دستاربندی فرمائی۔

قراردادیں

متحدہ سنی محاذ کے ڈپٹی رابطہ سیکرٹری مولانا محمد حنیف جالندھری نے کنونشن میں قراردادیں پیش کیں جنہیں متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ قراردادوں کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

محرم الحرام اور صفر کے دوران بد امنی اور فساد کا باعث بننے والے جلوسوں پر مکمل پابندی عائد کی جائے۔

چونکہ شیعہ حکومت کو زکوٰۃ نہیں دیتے اس لیے زکوٰۃ، عشر کمیٹیوں اور متعلقہ محکموں سے شیعہ ارکان و افسران کو فی الفور الگ کیا جائے اور جب وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تو شیعہ اداروں اور افراد کو

بھی زکوٰۃ نہ دی جائے بالخصوص شیعہ ادارہ فاطمیہ ٹرسٹ کے لیے زکوٰۃ فنڈ سے مخصوص کی گئی ایک کروڑ روپے کی امداد منسوخ کی جائے۔

اعلیٰ ملازمتوں اور کلیدی اسامیوں میں شیعہ ملازمین کو ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق جگہ دی جائے۔

زکوٰۃ و عشر کی جگہ شیعہ آبادی پر متبادل ٹیکس عائد کیا جائے۔

صحابہ کرامؓ کی توہین اور تنقید پر مشتمل لٹریچر ضبط کر کے مولفین، مترجمین اور ناشرین کے خلاف کاروائی کی جائے اور تحفظ ناموس صحابہؓ و اہل بیتؓ آرڈی ننس کو موثر طور پر نافذ کیا جائے۔

قران کریم کی حفاظت اور اشاعت کی کمیٹیوں سے شیعہ ارکان کو الگ کیا جائے۔

عالم اسلام ایرانی عازمین کی طرف حرمین شریفین میں خونریزی اور بد امنی کی کاروائیوں کا نوٹس لے اور حرمین شریفین میں فسادیوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا جائے۔

بنوری ٹاؤن کراچی، رحیم یار خان، خیرپور ٹامیوائی جھنگ، فیصل آباد، چکوال، حویلیاں، اٹک، کوہاٹ، پارہ چنار، دینہ، گولڑہ شریف، لیہ، اگوکی ضلع سیالکوٹ اور دیگر مقامات پر اہل سنت کے علماء اور کارکنوں کے خلاف وحشیانہ تشدد اور انتظامیہ کے جانبدارانہ طرز عمل کے بارے میں ہائی کورٹ کے جج کے ذریعے عدالتی تحقیقات کرائی جائے اور علماء اور کارکنوں کے خلاف جھوٹے مقدمات واپس لیے جائیں۔ بالخصوص مولانا حق نواز جھنگوی، حاکم علی، محمد یوسف مجاہد، طارق افضال اور دیگر اسیر راہنماؤں کو فی الفور رہا کیا جائے اور ان کے خلاف جھوٹے مقدمات درج کرنے والے افسران کے خلاف کاروائی کی جائے۔

قیام پاکستان کے بنیادی مقصد کی تکمیل اور نفاذِ اسلام کے لیے ملک کی اکثریتی سنی آبادی کے حقوق کا تحفظ کرتے ہوئے فقہ حنفی کو بطور واحد پبلک لاء نافذ کر کے جمہوری اصولوں کا احترام کیا جائے۔

براہم نزد واہ کینٹ میں صحابہ کرامؓ کی اعلانیہ توہین کے سلسلہ میں درج مقدمہ پر موثر کارروائی کی جائے۔

انجمن سپاہ صحابہؓ کے مرکزی راہ نماء مولانا ضیاء الرحمن فاروقی کو سمندری کی جامع مسجد کی خطابت سے معطل کرنے کے سلسلہ میں محکمہ اوقاف کی کاروائی معاندانہ ہے۔ اسے فی الفور واپس لیا جائے۔

راوی روڈ لاہور میں محمڈن شرعی یونیورسٹی اور دیگر مختلف ناموں سے گمراہی پھیلانے والے محمد اکرم عربی نامی شخص کے خلاف کارروائی کی جائے اور گمراہی کے اس اڈہ کو بند کرایا جائے۔

شرکاء کے اعزاز میں استقبالیہ

۱۱ جنوری کو شام چار بجے فلیٹیز ہوٹل لاہور میں حضرت مولانا محمد اجمل خان اور حضرت مولانا میاں محمد اجمل قادری کی طرف سے ''قومی سنی کنونشن'' کے شرکاء کے اعزاز میں استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا جس میں علماء اور کارکنوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

استقبالیہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے متحدہ سنی محاذ کے سرپرست مولانا عبد الستار تونسوی نے کہا کہ ہمارا مقصد کسی کے مذہب پر حملہ آور ہونا نہیں بلکہ اپنے مذہب کا دفاع ہے جو ہمارا جائز حق ہے۔

محاذ کے نو منتخب امیر مولانا مفتی احمد الرحمن نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم اپنے جائز حقوق مانگ رہے ہیں اور کسی قسم کا تشدد نہیں کرنا چاہتے۔ تشدد ہمارے خلاف ہو رہا ہے جسے حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اس لیے اگر حکومت نے روش تبدیل نہ کی تو حالات کی ذمہ داری اس پر ہوگی۔

متحدہ سنی محاذ کے رابطہ سیکرٹری مولانا زاہد الراشدی نے استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شیعہ جارحیت کا مسئلہ اب فرقہ وارانہ مسئلہ نہیں رہا بلکہ خالص سیاسی مسئلہ بن گیا ہے کیونکہ ایرانی انقلاب کے بعد ایران کی مذہبی قیادت اردگرد کے ممالک میں شیعہ اقلیت کو منظم و مسلح کر کے ہنگامے کروا رہی ہے اور ایرانی انقلاب کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے تشدد اور دہشت گردی کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہ صرف پاکستان بلکہ جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ کی تمام مسلم ریاستوں کو ایرانی دہشت گردی کا سامنا ہے اور اس کے سدباب کے لیے مشترکہ جدوجہد وقت کا اہم تقاضہ ہے۔

میاں محمد اجمل قادری نے استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اہل سنت کے حقوق و مفادات کو مجروح کرنے کے لیے ایک عرصہ سے جو کچھ ہو رہا ہے وہ سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ عالمی استعماری قوتیں اس خطہ میں اسلام کی بالادستی کو روکنا چاہتی ہیں اور اس مقصد کے لیے اس قسم کے فتنے کھڑے کیے جا رہے ہیں۔

استقبالیہ تقریب سے مولانا قاری سعید الرحمن، محمد ظہیر میر ایڈووکیٹ اور مولانا محمد امجد خان نے بھی خطاب کیا اور شرکاء نے پرجوش نعروں کے ساتھ متحدہ سنی محاذ کے عزم نو کا خیر مقدم کرتے ہوئے مولانا مفتی احمد الرحمن اور ان کے رفقاء کو مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

رپورٹ (2) : لندن میں دینی تحریکات کا مشترکہ اجلاس

یہ رپورٹ پاکستان کے داخلی ماحول میں اہل سنت کی جدوجہد کے حوالہ سے منعقد ہونے والے ''قومی سنی کنونشن'' کی ہے، اس کے ساتھ دس نومبر ۱۹۹٦ء کو لندن کے بلیک مور ہوٹل میں ورلڈ اسلامک فورم کی دعوت پر منعقد ہونے والے دینی تحریکات کے مشترکہ اجلاس کے بارے میں ایک رپورٹ پیش خدمت ہے جس میں پاکستان، سعودی عرب، شام، الجزائر، افغانستان اور دیگر ممالک سے تعلق رکھنے والی ایک درجن سے زائد دینی تحریکات کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں ''اسلامک ورلڈ لیگ'' کے عنوان سے ایک مشترکہ فورم تشکیل دیا گیا۔ اس فورم نے اگلے سال ۱۹ جولائی ۱۹۹۷ء کو آئرش ہال ھیمر سمتھ لندن میں اپنے سالانہ اجلاس میں ''لندن ڈیکلیریشن'' کے عنوان سے ایک مشترکہ اعلامیہ بھی تشکیل دیا اور اس اجلاس میں مذکورہ بالا ممالک کے علاوہ شام، عراق اور تونس کی اسلامی تحریکات کے نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ اس فورم کے اہداف اور دائرہ کار کے بارے میں قارئین کو آگاہ کرنے کے لیے وہ خطبہ استقبالیہ درج کیا جارہا ہے جو راقم الحروف نے اس مشترکہ اجلاس کے داعی کی حیثیت سے دس نومبر ۱۹۹٦ء کے اجلاس میں پیش کیا تھا:

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ سب سے پہلے آپ سب حضرات و احباب کا شکر گزار ہوں کہ ہماری دعوت کو آپ نے شرف قبولیت سے نوازا اور اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر اس سیمینار میں شرکت کے لیے تشریف لائے۔ اللہ رب العزت آپ سب دوستوں کو جزائے خیر سے نوازیں اور ہمارے اس مل بیٹھنے کو قبول فرماتے ہوئے دینی و ملی عزائم و مقاصد میں پیش رفت کے لیے با مقصد بنادیں۔ آمین یا رب العالمین۔

آپ سب حضرات اصحابِ فکر و دانش اور اربابِ جدوجہد و عمل ہیں اس لیے آپ کے سامنے اس وقت دنیا میں اسلام اور اس کے علمبرداروں کو درپیش چیلنج اور مشکلات کے سلسلہ میں تفصیلات پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ حضرات نہ صرف اس صورت حال سے بخوبی آگاہ ہیں بلکہ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سرگرم عمل بھی ہیں تاہم حالات کے مجموعی تناظر میں اس قدر عرض کرنا شاید نامناسب نہ ہو کہ ملت اسلامیہ اس وقت فکری، نظریاتی، سیاسی، معاشی، عسکری اور معاشرتی لحاظ سے جس سنگین اور ہمہ گیر بحران سے دوچار ہے تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی اور کفر و طاغوت نے اسلام اور اس کے علمبرداروں کو جس خوفناک یلغار کا ہدف بنا رکھا ہے اس نے قران کریم کے ارشادِ مقدس:

اذ جاء وکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر۔ (الاحزاب)

کے مطابق کفر کی طاقتوں کے اتحاد اور اہل اسلام کے خلاف ان کی ہمہ جہت یلغار کا نقشہ ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ عالمی استعمار نے صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں مسلسل ہزیمت اٹھانے کے بعد معرکہ آرائی کو عسکری میدان سے سیاسی، معاشی، سائنسی اور معاشرتی شعبوں میں منتقل کر لیا تھا اور صنعت و سائنس کے جدید ہتھیاروں سے مسلح ہو کر مسلم ممالک پر چڑھائی کر دی تھی جو گزشتہ دو صدیوں کے دوران عروج پر رہی اور اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا ہے کہ عالمی استعمار کے ہاتھوں:

ملت اسلامیہ خلافت اور جہاد کے نظام سے محروم ہو گئی ہے بلکہ اسلام کے ان دونوں مقدس فرائض کے خلاف اس قدر پروپیگنڈہ کیا گیا ہے کہ یہ مقدس دینی اصطلاحات خود مسلمانوں کے بہت سے طبقات کے لیے اجنبی ہو کر رہ گئی ہیں۔

عالم اسلام کو خلافت کی سیاسی مرکزیت سے بے گانہ کر کے علاقائی، نسلی اور لسانی قومیتوں کے نام پر پچاس سے زائد اکائیوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

مسلم ممالک میں کفر و طاغوت کے نظام مسلط کر دیے گئے ہیں اور ان کی حفاظت کے لیے استعمار کی نمائندہ حکومتیں سازش اور طاقت کے بل پر مسلسل قائم رکھی جا رہی ہیں جبکہ استعماری قوتوں کے مسلط کردہ یہ طاغوتی نظام مسلم ممالک کے عوام کے مزاج، عقیدہ اور روایات کے منافی ہونے کے باعث ان کے مسائل و مشکلات کے حل کی بجائے ان میں اضافہ اور انہیں الجھائے رکھنے کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

استعماری قوتوں نے عالم اسلام کے معاشی و معدنی وسائل پر غاصبانہ قبضہ جما رکھا ہے اور مسلم ممالک کی سائنسی، عسکری، سیاسی، معاشی اور تعلیمی پالیسیوں کو کنٹرول میں لیا ہوا ہے۔

لیکن اس سب کے باوجود عالمی استعمار مطمئن نہیں ہے اور اسے اپنے اندر کا کھوکھلا پن اور اسلام کی فطری قوت و صلاحیت کا ادراک اس حد تک بے چین کیے ہوئے ہے کہ وہ عالم اسلام کو ہر طرف سے جکڑ لینے اور بے دست و پا کر دینے کے بعد بھی اسلام اور اس کے علمبرداروں کے خلاف شور و غوغا کو ضروری سمجھ رہا ہے اور میڈیا وار کا دائرہ دن بدن وسیع کرتے ہوئے اسلام کے خلاف پراپیگنڈے میں نفسیاتی سکون و راحت محسوس کر رہا ہے۔

ان حالات میں مسلم ممالک کے اندر جو اصحاب عزیمت و استقامت اسلام کی سربلندی، کفر و طاغوت کے نظام کے خاتمہ اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے برسرپیکار ہیں ان کی مشکلات و تکالیف کا اندازہ کرنا کوئی دشوار امر نہیں ہے کیونکہ عالمی استعمار اور اس کی نمائندہ حکومتوں نے واقعتا ایسی فضا قائم کر رکھی ہے کہ بہت سے مسلم ممالک میں اسلام کی بالادستی اور نفاذ کی بات کرنا جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے مطابق کالقابض علی الجمرة (جلتے

انگاروں کو ہاتھ میں لینے) کا مصداق ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسلام ایک بار پھر دنیا میں اپنی لازوال صداقت اور غلبہ کا اظہار کرتا نظر آرہا ہے کہ تمام تر مشکلات اور جبر و تشدد کے باوجود دینی تحریکات بحمد اللہ مسلسل آگے بڑھ رہی ہیں۔

معزز شرکاءِ اجلاس! اس پس منظر میں اس امر کی اہمیت و ضرورت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے کہ مسلم ممالک کی دینی تحریکات میں باہمی رابطہ و تعاون کی فضا ہموار کی جائے اور اسلام کے غلبہ و نفاذ کے لیے کام کرنے والی جماعتیں اور حلقے عالمی استعمار کے مسلط کردہ علاقائی قومیتوں کے دائروں سے بالاتر ہو کر ''عالمی اسلامی تحریک'' کے جذبہ اور منصوبہ بندی کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل ہوں اور مشترکہ جدوجہد اور مساعی کے ساتھ اسے اسلام کی بالادستی اور خلافت کی بحالی کی صدی بنا دیں۔ اسی مقصد کے لیے الرابطۃ الاسلامیۃ العالمیۃ (اسلامک ورلڈ لیگ) کے نام سے ایک نئے فورم کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا ہے اور آپ حضرات کو زحمت دی گئی ہے کہ آج کے اس اجلاس میں شریک ہو کر ان تجاویز اور پروگرام کے بارے میں ہماری راہ نمائی فرمائیں جو ''اسلامک ورلڈ لیگ'' کی طرف سے مندرجہ ذیل صورت میں آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

1- الرابطۃ الاسلامیۃ العالمیۃ (اسلامک ورلڈ لیگ) کو ایک ایسے مشترکہ فورم کی صورت میں منظم کیا جائے جو مسلم ممالک میں کفر و طاغوت کے نظام کے خاتمہ اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے کام کرنے والی جماعتوں اور حلقوں کے درمیان رابطہ، مفاہمت اور معاونت کی راہ ہموار کرے۔

2- عالم اسلام کے معدنی و معاشی وسائل کو استعماری قوتوں کے قبضہ سے چھڑانے، سائنس اور ٹیکنالوجی میں عالم اسلام کو آج کے معیار پر لانے اور مسلم ممالک کی سیاسی، عسکری، معاشی

اور تعلیمی پالیسیوں کو آزاد کرانے کے لیے ملت اسلامیہ کی رائے عامہ کو بیدار اور منظم کیا جائے۔

3- خلافت اسلامیہ کے احیاء اور کفر و طاغوت کے نظاموں کے خاتمہ کے لیے اسلامی تحریکات کی جدوجہد کو باہم مربوط بنا کر عالمی سطح پر منظم کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

4- اسلام کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کے عملی خاکہ کے بارے میں عالم اسلام کے مختلف حلقوں کی دینی و علمی کاوشوں اور اجتہادات کو یکجا کر کے اجتماعی اجتہاد کے ذریعہ متفقہ خاکہ سامنے لایا جائے۔

5- اسلام کی دعوت اور اسلامی نظام کے تعارف کے لیے مساعی منظم کی جائیں ور اسلامی فلسفہ حیات کی اہمیت و برکات سے دنیا بھر کے لوگوں کو آگاہ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

6- اسلام اور اس کے احکام و قوانین کے خلاف مغربی میڈیا کے پراپیگنڈہ اور لابیوں کے پیدا کردہ شکوک و شبہات کے ازالہ کے لیے ابلاغ کے ہر ممکن ذرائع کو استعمال میں لایا جائے۔

اجلاس کے داعی کی حیثیت سے میں اور میرے رفیق محترم مولانا محمد عیسیٰ منصوری اپنی اس رائے کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ:

اسلامک ورلڈ لیگ کی جدوجہد کی علمی و فکری حدود کو اہل السنۃ والجماعۃ کے دائرہ میں محدود رکھا جائے اور اہل السنۃ والجماعۃ کے تمام مکاتب فکر مثلاً احناف، شوافع، مالکیہ، حنابلہ، ظواہر، سلفیہ، اشاعرہ اور ماتریدیہ کا یکساں احترام کرتے ہوئے ہر علاقہ میں اکثریتی آبادی کے فقہی مذہب کے عملی نفاذ کے اصول کو تسلیم کیا جائے۔

حکومتی لابیوں سے قطعی طور پر لا تعلق رہتے ہوئے جدوجہد کو آزادانہ بنیادوں پر استوار کیا جائے۔

جدوجہد کے اخراجات کے لیے باہمی رضاکارانہ تعاون اور مقاصد و پروگرام سے اتفاق رکھنے والے اصحاب خیر کی غیر مشروط معاونت پر قناعت کی جائے۔

جدوجہد کے لیے تعلیم اور میڈیا کے ذرائع کو بنیاد بنایا جائے اور اسے مکمل طور پر پرامن رکھتے ہوئے جبر اور تشدد کے ہر ذریعہ سے احتراز کیا جائے۔

محترم راہ نمایان ملت ! یہ ہیں ہمارے جذبات، عزائم اور تجاویز جو ہم نے آپ حضرات کی خدمت میں پیش کر دی ہیں، ہم اس سلسلہ میں آپ سے راہ نمائی کے طالب ہیں، معاونت و مشارکت کے خواستگار ہیں اور پر خلوص دعاؤں کے متمنی ہیں، خدا کرے کہ ہم ان عزائم اور تجاویز میں خلوص سے بہرہ ور ہوں، توفیق عمل سے فیض یاب ہوں اور کامیابی و قبولیت کی منزل سے ہمکنار ہوں۔ آمین یا رب العالمین۔

میں ایک بار پھر آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ کی یہ شفقت ''اسلامک ورلڈ لیگ'' کو آئندہ بھی حاصل رہے گی۔

دینی تحریکات کی ناکامی کے اسباب

یہ دو رپورٹیں پڑھ کر لازماً آپ دوستوں کے ذہنوں میں یہ سوال ابھرا ہوگا کہ جب ہم اس سطح پر اس قسم کے فیصلے کر لیتے ہیں اور پروگرام بھی بنا لیتے ہیں تو پھر بات آگے کیوں نہیں بڑھتی؟ میرے خیال میں اس سوال پر تفصیلی مباحثہ کی ضرورت ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینا ناگزیر ہے۔ گفتگو کے آغاز کے لیے ایجنڈے کے طور پر چند معروضات پیش کر رہا ہوں، اگر باذوق قارئین نے اس میں دل چسپی لی تو مباحثہ کے اگلے مراحل میں شامل ہو کر خوشی محسوس کروں گا۔ میرے خیال میں اس صورت حال کے چند اسباب درج ذیل ہیں:

ہمارے ہاں کسی کام کے لیے منصوبہ بندی اور کسی فیصلے کے لیے اس کے ممکنہ نفع و نقصان کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا ضروری نہیں سمجھا جاتا اور وقتی ماحول میں ہی ہم ہر قسم کا فیصلہ کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

کوئی بھی فیصلہ کرتے وقت زمینی اور معروضی حقائق کو سامنے رکھ کر اس کے قابل عمل ہونے کا اندازہ کرنا بھی ہمارے نزدیک ضروری تصور نہیں کیا جاتا۔

ہم کوئی فیصلہ کر کے اس کے لیے محنت کی ساری ضروریات سامنے نہیں رکھتے بلکہ صرف ایک دو پہلوؤں پر تھوڑی بہت محنت کر کے اسے کافی سمجھ لیتے ہیں۔

ہم کسی بھی کام میں تسلسل اور صبر کے ساتھ نتائج کا انتظار کرنے کے عادی نہیں ہیں اور جلد از جلد نتائج کے انتظار میں مایوسی کا شکار ہو کر دوسرے ذرائع ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن کے پاس وسائل ہیں وہ کام کا ذوق اور سلیقہ نہیں رکھتے جبکہ کام کا ذوق اور سلیقہ رکھنے اولے حضرات وسائل سے تہی دامن ہوتے ہیں۔ پھر وسائل رکھنے والے حضرات میں یہ حوصلہ نہیں ہوتا کہ وہ کام کا ذوق اور سلیقہ رکھنے والوں کا ہاتھ بٹائیں بلکہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس ذوق اور سلیقہ کو وسائل کے بل پر حاصل کر کے یہ کام بھی خود کرنے کی کوشش کریں جو عام طور پر ہو نہیں پاتا۔

ہم میں سے ہر شخص اور حلقہ کی اپنی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں اور اجتماعی اور ملی کاموں کو بھی انہی شخصی یا گروہی ترجیحات کے دائرے میں لانے کی ناکام کوشش میں ہم جدوجہد کے اجتماعی ماحول کو کھو بیٹھتے ہیں۔

بعض عناصر کی طرف سے اجتماعی جدوجہد کو جزوی اور غیر ضروری کاموں میں الجھا کر کے اسے غیر موثر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے جو عام طور پر کامیاب ہو جاتی ہے۔

ماضی کے تجربات کو سامنے رکھ کر ان سے سبق حاصل کرنے اور تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے کام کو آگے بڑھانے کیبجائے ہم ہر کام زیرو پوائنٹ سے شروع کرنے کے عادی ہیں جس کی وجہ سے جدوجہد کا تسلسل قائم نہیں رہتا۔

میں باذوق قارئین سے گزارش کروں گا کہ وہ اس سلسلہ میں کھلے دل کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کریں تاکہ ہم اجتماعی فکری کوشش کے ساتھ دینی جدوجہد کے کسی صحیح رخ کی طرف بڑھ سکیں۔

مجلہ / مقام / زیراہتمام:

روزنامہ اسلام، لاہور

تاریخ اشاعت: ۷ مارچ ۲۰۱۳ء

انتخابی سیاست اور نفاذ اسلام

جماعت اسلامی پاکستان کے امیر محترم سید منور حسن نے گزشتہ دنوں لاہور میں شباب ملی کے ''یوتھ کنونشن'' سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستان میں اسلام کا نفاذ گولی اور اسلحہ کی طاقت سے نہیں بلکہ صرف انتخابات کے ذریعہ ہوگا اور نفاذِ اسلام کی جدوجہد کا صحیح طریقِ کار یہی ہے۔ ہمیں سید صاحب محترم کے اس ارشاد سے اتفاق ہے کہ بندوق کی گولی کے ذریعہ اسلام اس ملک میں نہیں آسکتا اور ہم خود بھی اس پر متعدد بار یہ لکھ چکے ہیں کہ ایک مسلمان ریاست میں حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانا جسے فقہی اصطلاح میں ''خروج'' کہتے ہیں حکمرانوں کی طرف سے ''کفر بواح'' یعنی کھلے کفر کے اعلان کے سوا شرعاً جائز نہیں ہے اور جب تک ہمارا کوئی حکمران گروہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نظریاتی تشخص اور دستور کی اسلامی بنیادوں سے

خدانخواستہ صراحتاً انکار نہیں کرتا اس پر ''کفر بواح'' کا فتویٰ لگا دینا درست نہیں ہے بلکہ اگر ''خروج'' کے جواز کا کسی درجہ میں ماحول دکھائی دیتا ہو تو بھی اس کے قابل عمل ہونے کو فقہائے احناف نے جواز کی شرائط میں شامل کیا ہے، کیونکہ قابل عمل ہونے کے غالب امکان کے بغیر حنفی فقہاء کسی مسلم حکومت کے خلاف خروج کو بعض دوسری شرائط کے پائے جانے کے باوجود شرعاً درست قرار نہیں دیتے۔ جبکہ پاکستان کے معروضی حالات میں اس کا کسی درجہ میں کوئی امکان نہیں ہے کہ کوئی مسلح گروہ ملک کے کسی حصے پر قبضہ کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر سکے اور اس میں اپنی مرضی کا نظام نافذ کر لے۔ اس لیے ہم نے نفاذِ شریعت کے خواہش مند اور اس کے لیے جدوجہد کرنے والے مسلح عناصر سے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ وہ مسلح جدوجہد کا راستہ ترک کر کے پُرامن جدوجہد کا طریقِ کار اختیار کریں اور اس کے لیے جمہور علماء امت کو اعتماد میں لیں۔

جہاں تک ملک میں اسلام کے نفاذ، قرآن و سنت کی دستوری و قانونی بالادستی اور شرعی احکام کی عملداری کی بات ہے تو یہ ملک کے قیام کے مقاصد میں شامل ہے اور اس کی دستور پاکستان نے گارنٹی دے رکھی ہے، مگر اس پر عمل درآمد سے مسلسل اور عمدًا گریز کیا جا رہا ہے اور نفاذِ اسلام کی دفعات سمیت دستورِ پاکستان کے بیشتر حصے یا تو عملاً معطل پڑے ہیں اور یا انہیں ملکی اور بین الاقوامی اسٹیبلشمنٹ کے طاقتور سیکولر عناصر اپنے مفادات اور ایجنڈے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ ملک کو اس مخمصے اور دلدل سے نکالنے کے لیے بہرحال ایک زبردست قسم کی عوامی جدوجہد کی شدید ضرورت ہے اور اس جدوجہد کی ضرورت اور طریق کار کے حوالہ سے ہم ایک عرصہ سے گزارشات پیش کرتے آرہے ہیں۔

البتہ سید منور حسن صاحب کے اس ارشاد سے ہمیں اتفاق نہیں ہے کہ نفاذِ اسلام کا راستہ صرف انتخابات ہیں، کیونکہ اس حوالہ سے صرف الیکشن پر انحصار کو ہم وقت اور صلاحیتوں کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ اولاً اس لیے کہ پاکستان میں انتخابات کا نظام اس قدر کھوکھلا بلکہ پُر فریب ہے کہ اس کے ذریعہ عوام کے صحیح نمائندوں کا انتخاب ممکن ہی نہیں ہے جس کی شہادت حالیہ انتخابات کے دوران مختلف حلقوں سے ہزاروں کی تعداد میں جعلی ووٹوں کے استعمال کی سرکاری اداروں کی طرف سے توثیق و تصدیق کی صورت میں سامنے آچکی ہے۔ اس لیے الیکشن کے موجودہ نظام اور طریقِ کار کو بنیادی طور پر تبدیل کیے بغیر عام انتخابات میں عوام کی صحیح نمائندہ قیادت کا سامنے آنا محال ہے اور ثانیاً اس لیے کہ ہماری وہ دینی جماعتیں جو قومی سیاست میں شریک ہیں، انہوں نے کبھی سنجیدگی کے ساتھ عام انتخابات میں حصہ لینے اور ان میں کامیابی حاصل کرنے کی پلاننگ ہی نہیں کی۔ چند مواقع سے ہٹ کر عام انتخابات کے مختلف ادوار میں ہماری دینی جماعتوں کا الیکشن میں حصہ لینے کا مقصد صرف اپنے وجود کا اظہار اور تشخص کا تعارف رہا ہے جو عام طور پر سیاسی کی بجائے فرقہ وارانہ ہوتا ہے۔ اس میں بھی مناسب جدوجہد نہ ہونے کی وجہ سے اکثر اوقات پیش رفت کی بجائے پسپائی ان کا مقدر بن جاتی ہے اور آئندہ بھی اس سے ہٹ کر کسی نتیجہ کی توقع عبث ہوگی۔

ہمارے نزدیک نفاذِ اسلام کی جدوجہد کا اصل راستہ وہی ہے جو ہمارے بزرگوں نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی مالٹا کی قید سے واپسی پر ان کی راہ نمائی میں اختیار کیا تھا اور آزادی کی جدوجہد کے لیے پُر امن عوامی سیاسی تحریک کے ذریعہ برطانوی استعمار کے خلاف عدم تشدد پر مبنی مزاحمت کی صبر آزما محنت کر کے اسے یہاں سے رخصت ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ تحریک خلافت، جمعیۃ علماء ہند، مسلم لیگ اور مجلس احرار اسلام کی تحریکات اس کی زندہ

جاوید تاریخی شہادتیں ہیں اور ہمارے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے ہم نہ مسلح جدوجہد کے طریقِ کار کی حمایت کرتے ہیں اور نہ ہی صرف الیکشن پر قناعت کرنے کو نفاذِ اسلام کی جدوجہد کا درست طریقِ کار سمجھتے ہیں۔

نفاذِ اسلام کے لیے بین الاقوامی اور ملکی اسٹیبلیشمنٹ کے منافقانہ کردار اور دوغلے رویے کے خلاف شدید عوامی مزاحمت درکار ہے کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے، البتہ یہ مزاحمت اسلحہ اور ہتھیار کی بجائے اسٹریٹ پاور، سول سوسائٹی، پر امن عوامی تحریک اور منظم احتجاجی قوت کے ذریعہ ہونی چاہیے۔ اس سے ہٹ کر صرف انتخابات اور نارمل سیاسی جدوجہد پر اکتفاء کرتے چلے جانا محض خوش فہمی بلکہ خود فریبی کہلائے گا اور اس فریب کے دائرے سے ہماری دینی جماعتیں جس قدر جلد باہر نکل آئیں وہ ان کے لیے اور ملک و قوم کے لیے بہتر ہوگا۔

اس کے ساتھ ایک اور شکوہ کا بھی ہم تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے انتہائی عزیز نوجوان اور غازی عبد الرشید شہیدؒ کے فرزند ہارون عبد الرشید سلّمہ نے پرویز مشرف کیس کے حوالہ سے گزشتہ روز کیا ہے کہ ملک کے علماء نے اس جدوجہد میں ان کا ساتھ نہیں دیا اور اگر علماء کی خاموشی کی وجہ سے پرویز مشرف ملک سے نکل جانے میں کامیاب ہوگئے تو اس کی ذمہ داری علماء پر ہوگی۔ یہ شکوہ صرف عزیزم ہارون سلّمہ کو نہیں بلکہ قبائلی علاقہ جات کی کالعدم تحریک طالبان سمیت بہت سے دیگر دینی حلقوں کو بھی ہے کہ ملک کے جمہور علماء ان کی دینی جدوجہد میں ان کا ساتھ نہیں دے رہے۔ جبکہ ہمارا تجربہ اس سے مختلف ہے، راقم الحروف کو بھی تحریکی دنیا کا کارکن سمجھا جاتا ہے، درجنوں تحریکوں میں مختلف سطحوں پر متحرک کردار ادا کرنے کی سعادت بحمد اللہ تعالیٰ حاصل کر چکا ہوں اور اسے اپنے لیے باعث نجات سمجھتا ہوں۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ دینی جدوجہد کے جس مرحلہ میں بھی جمہور علماء کرام اور ان کی علمی و فکری

قیادتوں کو اعتماد میں لے کر ان کی مشاورت سے کسی تحریک کا پروگرام طے کیا گیا ہے جمہور علماء بلکہ عوام نے بھی کبھی مایوس نہیں کیا۔ تحریک ختم نبوت، تحریک نظام مصطفیؐ اور شریعت بل کی تحریکات اس پر شاہد ہیں، البتہ ملک کے کسی بھی دینی طبقہ اور جماعت نے کسی بھی دینی جدوجہد کا پروگرام اگر از خود طے کیا ہے، اس کے اہداف، ترجیحات اور طریق کار کے تعین میں جمہور علماء کی قیادتوں کو اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور سب کچھ از خود طے کر کے جمہور علماء کو اپنے پیچھے چلنے کی دعوت دی ہے تو اسے بہرحال مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور یہ ایک فطری بات ہے اس لیے کہ اگر جمہور علماء دینی جدوجہد کے عنوان سے ہر آواز کی طرف لپکنا شروع کر دیں تو ملک کے عمومی دینی ماحول کی رہی سہی اجتماعیت بھی داؤ پر لگ جائے گی جو کسی طور بھی دین اور ملک و قوم کے مفاد میں نہیں ہے۔

ہمیں دین کے لیے کسی بھی حوالہ سے جدوجہد کرنے والوں کے خلوص، قربانیوں اور سعی و محنت سے انکار نہیں ہے لیکن ملک کے عمومی دینی ماحول کا تعاون حاصل کرنے کے لیے جمہور علماء کرام بلکہ مختلف مکاتب فکر کی دینی، علمی اور فکری قیادتوں کو جدوجہد کے مقاصد، ترجیحات اور طریقِ کار کے بارے میں اگر اعتماد میں نہیں لیا جائے گا تو ان سے عدم تعاون کا شکوہ کرنے کا بھی کوئی جواز نہیں ہوگا۔

مجلہ / مقام / زیر اہتمام:

روزنامہ اسلام، لاہور

تاریخ اشاعت:

۱۶ اکتوبر ۲۰۱۳ء

سودی نظام کے خلاف دینی حلقوں کی مشترکہ مہم

قائد اعظم محمد علیؒ جناح نے ۱۵ جولائی ۱۹۴۸ء کو کراچی میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر اپنے خطاب میں کہا تھا کہ:

''میں نہایت اشتیاق کے ساتھ آپ کی ریسرچ فاؤنڈیشن کے تحت موجود بینکنگ نظام کو اسلامی معاشی اور معاشرتی افکار کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی سعی و کوشش کو دیکھنا چاہوں گا۔ مغرب کے معاشی نظام نے انسانیت کے لیے کچھ ناقابل حل مسائل پیدا کیے ہیں اور بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ کوئی معجزہ ہی اسے تباہی سے بچا سکتا ہے۔ یہ نظام انسانوں کے مابین معاشی عدل قائم کرنے اور عالمی سطح پر ہونے والی کشمکش کے تدارک میں ناکام ہو چکا ہے۔ اس کے برخلاف یہی نظام ماضی میں ہونے والی دو عالمی جنگوں کا سبب بنا ہے۔ دنیائے مغرب اپنی صنعتی ترقی اور مشینی ایجادات و اختراعات کے باوجود بدترین انتشار میں بتلا ہے جو تاریخ میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد معاملہ ہے۔ مغربی معاشی نظریے اور عمل کو اختیار کرنا ہمیں اس آسودہ معاشرے تک پہنچانے کا باعث نہیں ہو سکتا جو ہماری منزل ہے۔ ہمیں اپنی تقدیر خود اپنے ظروف و احوال کے مطابق لکھنی ہوگی اور اسلام کے معاشرتی عدل اور انصاف پر مبنی ایک معاشی نظام کو دنیا کے سامنے پیش کرنا ہوگا جس کے ذریعہ ہم بحیثیت مسلمان اپنا فرض ادا کر سکیں اور انسانیت کے سامنے پیغام امن پیش کر سکیں جو اس کی فلاح و بہبود، انبساط اور ترقی کا ضامن ہوگا۔''

مگر بانی پاکستان کی اس واضح ہدایت کے باوجود ملک کا معاشی نظام ابھی تک مغرب کے معاشی نظریات اور اصول و ضوابط کے مطابق چل رہا ہے اور اس میں اصلاح کی کوئی کوشش کامیاب

ہوتی دکھائی نہیں دے رہی۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم قومی معیشت میں سودی نظام اور مغرب کے معاشی اصولوں کے تمام تر تلخ نتائج، نحوستوں اور تباہ کاریوں کو دیکھتے بلکہ بھگتتے ہوئے بھی میر تقی میر مرحوم کے اس شعر کا مصداق بنے ہوئے ہیں کہ:

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب

اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

جس معاشی نظام نے ہماری قومی معیشت کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے اور جو ہمارے ایمان و عقیدہ سے متصادم ہونے کے ساتھ ساتھ قومی مفادات کے بھی منافی ہے، بدستور ہم پر مسلط ہے اور رولنگ کلاس قوم کو اس دلدل سے نجات دلانے کے لیے کوئی راستہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

پاکستان میں نافذ ہونے والے ہر دستور میں اس کا وعدہ کیا گیا کہ قوم کو سودی نظام سے جلد از جلد نجات دلائی جائے گی۔ حتیٰ کہ 1973ء کے دستور کے آرٹیکل 380 کی ذیلی دفعہ F میں کہا گیا ہے کہ ''حکومت جس قدر جلد ممکن ہو سکے ربا کو ختم کرے گی۔''

قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے دستوری طور پر قائم ہونے والے ادارہ اسلامی نظریاتی کونسل نے 3 دسمبر 1969ء میں قرار دیا تھا کہ:

''موجودہ بینکاری نظام کے تحت افراد، اداروں اور حکومتوں کے درمیان قرضوں اور کاروباری لین دین میں اصل رقم پر جو اضافہ یا بڑھوتری کی جاتی ہے وہ ربا کی تعریف میں آتی ہے، سیونگ سرٹیفکیٹ میں جو اضافہ دیا جاتا ہے وہ بھی سود میں شامل ہے، پراویڈنٹ فنڈ اور پوسٹل بیمہ زندگی میں جو سود دیا جاتا ہے وہ بھی ربا میں شامل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ صوبوں، مقامی اداروں

اور سرکاری ملازمین کو دیے گئے قرضوں پر اضافہ بھی سود ہی کی ایک قسم ہے لہٰذا یہ تمام صورتیں حرام اور ممنوع ہیں۔''

اسلامی نظریاتی کونسل نے اس کے بعد سودی نظام کے خاتمے اور متبادل معاشی نظام کے حوالہ سے ایک جامع رپورٹ 25 جون 1980ء کو حکومت کے سامنے پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ ان تجاویز پر عمل کی صورت میں دو سال کے اندر پاکستان کی معیشت کو سود سے پاک کیا جا سکتا ہے۔

وفاقی شرعی عدالت نے 1990ء میں اس سلسلہ میں ایک واضح فیصلہ صادر کیا جس میں تمام مروّجہ سودی قوانین کا جائزہ لے کر وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی کہ وہ 30 جون 1992ء تک ان قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق تبدیل کر لیں ورنہ یہ سب قوانین یکم جولائی 1992ء تک خود بخود کالعدم ہو جائیں گے۔

وفاقی شرعی عدالت کے اس تاریخی فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ آف پاکستان میں اپیل دائر کی گئی جس کی سماعت میں سات سال کی مسلسل تاخیر کے بعد 1999 میں اس کے لیے بینچ تشکیل دیا گیا اور سپریم کورٹ نے وفاقی شرعی عدالت کی توثیق کرتے ہوئے کہ وہ جون 2001ء تک وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے پر عمل مکمل کر کے ملک کو سود سے پاک کر دے۔ مگر یہ فیصلہ بھی اب اپیل در اپیل کے مراحل میں ہے اور حکومت نے اس پر عمل کرنے کی بجائے تاخیری حربوں کا سہارا لے رکھا ہے۔

اس پس منظر میں ''ملی مجلس شرعی'' کی تحریک پر گزشتہ دو تین ماہ کے دوران مختلف مکاتب فکر کے سرکردہ راہ نماؤں کے درمیان مرکز جماعت الدعوۃ، دفتر جماعت اسلامی، دفتر تنظیم اسلامی اور مسجد خضراء لاہور میں باہمی مشاورت کی متعدد نشستیں ہوئی ہیں جن میں یہ طے پایا ہے کہ وفاقی

شرعی عدالت میں زیر سماعت اپیل کے حوالہ سے ''ملی مجلس شرعی پاکستان'' جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی کے تعاون سے علمی و فکری جدوجہد جاری رکھے گی جبکہ ملک کے دینی حلقوں میں اس مقصد کے لیے باہمی ربط و تعاون کے فروغ اور عوام میں بیداری و آگہی پیدا کرنے کی غرض سے ایک مستقل فورم ''تحریک انسداد سود پاکستان'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے اور اس کی رابطہ کمیٹی کے کنوینر کی ذمہ داری راقم الحروف کو سونپی گئی ہے۔

رابطہ کمیٹی میں مولانا عبد المالک خان، مولانا عبد الرؤف فاروقی، مولانا امیر حمزہ، علامہ خلیل الرحمن قادری، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، ڈاکٹر محمد امین، مولانا عبد الرؤف ملک، سردار محمد خان لغاری، قاری محمد یعقوب شیخ، مولانا حافظ عبد الغفار روپڑی، جناب حافظ عاکف سعید، مولانا مجیب الرحمن انقلابی، میاں محمد اویس، مولانا حافظ محمد نعمان، مولانا قاری جمیل الرحمن اختر، اور سید جواد حسین نقوی کے علاوہ ممتاز دانش ور جناب اوریا مقبول جان بھی شامل ہیں، جبکہ جن حضرات نے خطوط اور زبانی پیغامات کے ذریعہ تائید و حمایت کی ہے، ان میں مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا محمد اویس نورانی، مولانا قاری زوار بہادر، ڈاکٹر زاہد اشرف، مولانا عبد القیوم حقانی اور مولانا پیر عبد الرحیم نقشبندی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اس مہم کے آغاز کے طور پر 21 فروری کو ''یوم انسداد سود'' کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس موقع پر مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام اور خطباء نے جمعۃ المبارک کے خطبات میں سودی نظام کی نحوست و حرمت کے ساتھ ساتھ مقتدر طبقات کے تاخیری حربوں کا ذکر کیا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ملک کو سودی نظام کی لعنت سے نجات دلا کر بابرکت اسلامی معاشی نظام کے نفاذ کی راہ ہموار کرے۔

ملک بھر میں تمام مکاتب فکر اور طبقات کے علماء کرام، ارباب دانش، راہ نماؤں اور کارکنوں سے گزارش ہے کہ اس کار خیر میں ہمارے ساتھ شریک ہو کر ملکی نظام معیشت کو سود کی لعنت سے نجات دلانے میں کردار ادا کریں۔

مجلہ / مقام / زیر اہتمام:

روزنامہ اسلام، لاہور

تاریخ اشاعت: ۲۰ فروری ۲۰۱۴ء (غالباً)

دینی تحریکات کی کامیابی اور ناکامی

اس سال الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں سالانہ دورۂ تفسیر کو شعبان المعظم کے دوران مکمل کرنے کا تجربہ مجموعی طور پر کامیاب رہا۔ 2 شعبان کو افتتاحی تقریب سے جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے مہتمم مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی نے خطاب کیا، جبکہ 27 شعبان المعظم کو اختتامی نشست ہوئی جس میں شرکاء کو اسناد دی گئیں اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے صدر ڈاکٹر محمد سعد صدیقی کے علاوہ مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ کے مہتمم مولانا داؤد احمد میواتی نے خطاب کیا۔ ملک کے مختلف حصوں سے چالیس سے زائد حضرات نے شرکت کی جن میں اکثریت فضلاء کرام اور منتہی طلبہ کی تھی۔ راقم الحروف کے علاوہ مولانا فضل الہادی، مولانا ظفر فیاض، مولانا حافظ محمد یوسف، مولانا حافظ محمد رشید، حافظ محمد عمار خان ناصر، مولانا وقار احمد، ڈاکٹر جنید ہاشمی، مولانا سید متین شاہ اور دیگر اساتذہ نے پڑھایا۔ اور قرآن کریم کے مکمل ترجمہ و تفسیر کے علاوہ مختلف موضوعات پر تیس سے زائد محاضرات ہوئے۔ حسب سابق اس

دفعہ بھی ایک موضوع پر اساتذہ اور طلبہ کے درمیان مذاکرہ کی خصوصی نشست کا اہتمام کیا گیا جس کا عنوان یہ تھا کہ دینی تحریکات کی کامیابی اور ناکامی کے اسباب کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس حوالہ سے اساتذہ اور طلبہ کی تفصیلی گفتگو بہت دل چسپ تھی جو ''الشریعہ'' میں شائع ہوگی۔ البتہ راقم الحروف نے بطور تمہید جو باتیں کہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ ! آج ہم سب اس عنوان پر آپ حضرات سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں کہ مختلف دینی تحریکات میں محنت اور قربانیوں کے باوجود ہم کامیابی حاصل نہیں کر پاتے۔ تو کیا یہ کہہ کر آگے بڑھ جانا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یونہی منظور تھا اور ہمیں نیت اور محنت کا ثواب تو مل ہی جائے گا، یا اس ناکامی کے اسباب کی نشاندہی کرنا اور ان کے ازالہ کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ بات درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یونہی منظور تھا اور یہ بات بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ مقصد کے حصول میں کامیاب نہ ہونے کے باوجود خلوص نیت اور محنت و قربانی کا ثواب بہرحال ملتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں ناکامی کے اسباب و عوامل کا تجزیہ کرنا بھی ضروری ہے اور یہ تجزیہ نہ تو ثواب کے منافی ہے اور نہ ہی تقدس اور بزرگی میں اس سے کوئی فرق آتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے غزوہ احد اور غزوہ حنین کے موقع پر صحابہ کرامؓ کی وقتی ہزیمت کا تذکرہ کیا ہے، اس کے اسباب بیان کیے ہیں، اس کے مطابق ڈانٹ ڈپٹ بھی کی ہے، اور پھر معافی اور پورا اجر و ثواب دینے کا اعلان بھی کیا ہے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ احد کے موقع پر صحابہ کرامؓ کی صفوں میں جو خلفشار پیدا ہوا، اس کا سبب پہاڑی کے درے پر ڈیوٹی دینے والوں کی جلد بازی اور باہمی اختلاف تھا۔ جبکہ حنین کے موقع پر قدم اکھڑ جانے کی وجہ اکثریت میں ہونے کی وجہ سے دلوں میں پیدا ہونے والی بے پرواہی تھی۔

اس لیے ہمیں بھی آج جس جدوجہد اور تحریک میں کامیابی نہ ملے، اس کے اسباب کا جائزہ لینا اور عوامل کی نشاندہی کر کے ان کے ازالہ کی فکر کرنا چاہیے۔ اور یہ دین کا عین تقاضہ ہے۔ مثال کے طور پر برصغیر کی ایک عظیم تحریک کا حوالہ دینا چاہوں گا جسے تحریک خلافت کہا جاتا ہے۔ یہ تحریک اب سے ایک صدی قبل پورے جنوبی ایشیا میں ترکی کی خلافت عثمانیہ کی حمایت میں بپا ہوئی تھی اور مسلمانوں کی پہلی منظم اور ہمہ گیر عوامی سیاسی تحریک تھی جس کا ہندوؤں اور دیگر برادران وطن نے بھی ساتھ دیا تھا۔ برطانیہ دیگر یورپی قوتوں کے ساتھ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے درپے تھا اور ہم برطانیہ کی رعایا تھے۔ اس لیے ہم نے منظم سیاسی تحریک کے ذریعہ برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ خلافت کو ختم کرنے سے گریز کیا جائے۔ اس تحریک کی قیادت مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، مولانا ظفر علی خانؒ، حکیم محمد اجمل خانؒ اور دیگر قائدین نے کی تھی۔ جن کی پشت پر حضرت شیخ الہندؒ کا فکر و فلسفہ تھا۔ تحریک اس قدر پر جوش تھی کہ برصغیر کا کوئی گوشہ اس کی تگ و تاز کے دائرے سے باہر نہیں تھا۔ مگر تحریک اپنے مقاصد حاصل نہ کر سکی جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ خود ترکوں نے خلافت کے خاتمہ کے لیے یورپی قوتوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور خلافت سے دست برداری اختیار کر لی تھی۔ اس کے نتیجے میں ہماری تحریک خلافت بھی اپنے تمام تر جوش و خروش کے باوجود سرد پڑ گئی اور بظاہر ناکام ہو گئی۔

مگر اس حوالہ سے میں ایک بات عرض کرنا چاہوں گا کہ تحریک خلافت بظاہر اپنا ہدف حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی لیکن میں اسے ناکام تحریک نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ اس کے بعد سیاسی میدان میں آزادی کی جس قدر تحریکات منظم ہوئیں ان میں کارکنوں کی بنیادی کھیپ وہی تھی جس نے تحریک خلافت میں سیاسی جدوجہد کی تربیت حاصل کی تھی۔ اس طرح تحریک خلافت برصغیر کی آئندہ سیاسی تحریکات کے لیے کارکنوں کی نرسری ثابت ہوئی۔ کانگریس، مسلم

لیگ، جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام کے کارکنوں کا بڑا حصہ تحریک خلافت کے تیار کردہ لوگوں پر مشتمل تھا، بلکہ مجلس احرار اسلام تو بنیادی طور پر تحریک خلافت کے پنجاب سے تعلق رکھنے والے راہ نماؤں پر ہی مشتمل تھی، جنہوں نے اپنی جدوجہد کو سٹاپ کرنے ی بجائے مجلس احرار اسلام ہند کے نئے نام کے ساتھ میدان عمل میں سرگرم رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ، چودھری افضل حقؒ، مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ، اور دیگر اکابر تحریک خلافت کے راہ نما تھے۔ جو مجلس احرار اسلام کے نام کے ساتھ آگے بڑھے تھے اور برصغیر میں سیاسی جدوجہد اور عوامی خطابت کی ایک نئی روایت کے بانی ثابت ہوئے۔ اس لیے تاریخ کے طالب علم کے طور پر میری رائے یہ ہے کہ تحریک خلافت عثمانیہ خلافت کو بچانے میں تو کامیاب نہیں ہوئی تھی لیکن جنوبی ایشیا کو پر امن اور عوامی سیاسی جدوجہد کا نیا رخ دینے اور سیاسی جمود کو توڑ کر سیاسی حوصلہ اور جرأت کا ماحول پیدا کرنے میں ضرور کامیاب ہو گئی تھی۔

اس پس منظر میں ہماری گزارش ہے کہ ہمیں اپنی دینی جدوجہد اور تحریکات کی ناکامی کے اسباب و عوامل کا ضرور جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ کیونکہ اسی طرح ہم ان تجربات سے اپنی مستقبل کی تحریکات کو بہتر بنیادوں پر استوار کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

مجلہ / مقام / زیر اہتمام:

روزنامہ اسلام، لاہور

تاریخ اشاعت:

۲۸ جون ۲۰۱۴ء (غالباً)

حالیہ اقدامات اور علماء کی فکرمندی

گزشتہ روز اسلام آباد کی قدیم ترین مسجد میں (جو ''اولیٰ مسجد'' کے نام سے معروف ہے) ایک سیرت کانفرنس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ محمدی مسجد شہزادٹاؤن میں چند سرکردہ علماء کرام کے ساتھ مشاورتی نشست میں شریک ہوا اور ملک میں دینی جدوجہد کی موجودہ صورت حال کے بارے میں بہت سے فکرمند دوستوں کے ساتھ گفتگو کا موقع ملا۔ دیکھا کہ اس بات پر فکرمندی اور تشویش مسلسل بڑھتی جا رہی ہے کہ ملک میں دینی اقدار و روایات کو کمزور کرنے، نافذ شدہ چند اسلامی قوانین و ضوابط کو غیر مؤثر بنانے، اور لادینی فلسفہ وثقافت کو ترویج دینے کی کوششوں میں جو تیزی اور وسعت دیکھنے میں آرہی ہے، دینی حلقوں میں بے توجہی، بے حسی اور ہر قسم کے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرلینے کا رجحان اس سے کہیں زیادہ بڑھتا جا رہا ہے۔
بالخصوص قومی سیاست میں دینی حلقوں کی نمائندگی کرنے والی قیادت کی قناعت پسندی ایک طرح کا روگ سا بن کر رہ گئی ہے۔ جو معاملات اس دوران گفتگو کا موضوع بنے ان میں سے چند یہ ہیں:

سعودی عرب اور ایران کے درمیان کشیدگی کو کم کرنے کے لیے وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف کے عزم اور پروگرام کو کم وبیش ہر جگہ سراہا جا رہا ہے۔ البتہ سنجیدہ حلقوں کا یہ احساس بھی قابل توجہ ہے کہ کشیدگی جس حد تک آگے جا چکی ہے اسے بریک لگانے کے ساتھ ساتھ اس امر کا اہتمام ضروری ہے کہ حالات کو اس رخ پر لے جانے اور موجودہ صورت حال تک پہنچانے والے اسباب و عوامل کا جائزہ لیا جائے۔ کیونکہ گزشتہ تین عشروں کے دوران مشرق وسطیٰ میں سنی شیعہ اختلافات کا دائرہ وسیع کرنے اور ان کو مسلح گروہی تصادم کا رنگ

دینے کے لیے مختلف اطراف سے جو کام ہوا ہے اس کی نشاندہی اور اسے روکنے بلکہ ''ریورس گیئر'' لگانے کی تدابیر اختیار کیے بغیر مشرق وسطیٰ کو اس فرقہ وارانہ تصادم کی دلدل سے نہیں نکالا جا سکتا۔ خدا کرے کہ میاں محمد نواز شریف اور ان کے رفقاء اس کار خیر کو بحسن و خوبی آگے بڑھا سکیں، آمین یا رب العالمین۔

بعض علماء کرام نے صوبہ سندھ کے حوالہ سے سامنے آنے والی اس خبر پر تشویش کا اظہار کیا کہ حکومت کی طرف سے خطباء کو جمعۃ المبارک میں بیان کرنے کے لیے سرکاری طور پر مرتب کردہ خطبات مہیا کرنے اور انہیں اس کا پابند بنانے کا پروگرام طے پا گیا ہے اور اس کا دائرہ ملک بھر میں پھیلانے کی تجویز بھی مقتدر حلقوں میں چل رہی ہے۔

کچھ علماء کرام نے اس بات کا ذکر کیا کہ شادی کے لیے لڑکی کی عمر طے کرنے اور اس سے کم عمر میں شادی کو ممنوع قرار دینے کے لیے قانون کا ایک مجوزہ مسودہ قانون ساز حلقوں میں زیر بحث ہے اور اس کے لیے بہت سی این جی اوز اور بین الاقوامی حلقے متحرک ہیں۔

اس دوران سودی نظام کے خاتمہ کی جدوجہد بھی زیر بحث آئی اور اس بات کو سراہا گیا کہ اگرچہ وفاقی شرعی عدالت میں زیر بحث مقدمہ سردست تعطل کا شکار ہے جس کی وجہ سے ''تحریک انسداد سود'' کے عنوان سے مختلف مکاتب فکر کی مشترکہ جدوجہد میں سرگرمی کا ماحول پیدا نہیں ہو رہا۔ لیکن اس کے باوجود تنظیم اسلامی پاکستان اپنے امیر محترم حافظ عاکف سعید کی سربراہی میں اس کے لیے مسلسل متحرک ہے اور اس کے لیے مختلف شہروں میں سیمیناروں کا اہتمام کر رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی پرائیویٹ سیکٹر میں سود کی مختلف صورتوں کے خلاف احساس پیدا ہو رہا ہے جس کے تحت پنجاب کے مختلف شہروں میں پرائیویٹ سود پر پابندی کے قانون کی طرف لوگ متوجہ ہو رہے ہیں۔ اور بعض مقامات پر اس ایکٹ کے تحت پرائیویٹ سود خوروں

کے خلاف مقدمات بھی درج ہوئے ہیں۔ گوجرانوالہ کے تھانہ سیٹلائیٹ ٹاؤن میں بھی گزشتہ دنوں اس سلسلہ میں ایک ایف آئی آر درج ہو چکی ہے۔

ہمارے خیال میں بیداری کے اس احساس کو بڑھانے کی ضرورت ہے جس کے لیے دینی جماعتیں اور خطباء کرام زیادہ مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ جبکہ اس قسم کے مسائل پر رائے عامہ کو بیدار و منظم کرنے کی قومی سطح پر جس جدوجہد کی ضرورت ہے اس کے لیے باہمی رابطہ مہم اور مفاہمت و تعاون کا فروغ وقت کا ایک اہم تقاضا ہے۔

پرائیویٹ سود کی ممانعت کے لیے پنجاب اسمبلی نے اب سے آٹھ برس قبل ایک قانون منظور کیا تھا جو صوبے میں اس وقت سے نافذ ہے۔ ہم اس قانون کا متن علماء کرام اور دینی کارکنوں کی آگاہی کے لیے درج کر رہے ہیں۔ اس امید کے ساتھ کہ اس قانون پر عملدرآمد کا ماحول پیدا کرنے کے لیے دینی جماعتیں اور کارکن کسی نہ کسی حد تک ضرور کردار ادا کریں گے۔

شخصی امتناع سودی قرض ایکٹ ۲۰۰۷ء

۲۰۰۷ء کا ایکٹ نمبر ٦ گورنمنٹ آف پنجاب، غیر معمولی، ۳۰ جون ۲۰۰۷ء یہ ایکٹ شخصی طور پر سود پر قرض دینے کی ممانعت سے متعلق ہے۔

نمبر: DAP. Logu. 3(11) 2003/934۔ شخصی امتناع سودی قرض بل ۲۰۰۷ء چونکہ پنجاب اسمبلی نے ۱۲، جون ۲۰۰۷ء کو منظوری دے دی تھی، لہٰذا اب اسے پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے ایکٹ کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔

1- تمہید: چونکہ پنجاب میں سودی قرض کی ممانعت کا قانون بنانا پیش نظر ہے لہٰذا مندرجہ ذیل قانون بنایا گیا۔

2- مختصر عنوان، دائرہ عمل اور ابتداء: ۱۔اس قانون کا نام شخصی امتناع سودی قرض ایکٹ ۲۰۰۷ء ہوگا۔

3- اس کا دائرہ عمل پنجاب کا سارا صوبہ ہوگا۔ ۳۔ اس پر فوری طور پر عمل درآمد ہوگا۔

تعریفات / اصطلاحات: اس ایکٹ میں مستعمل الفاظ کے درج ذیل مخصوص معنی ہوں گے اِلاَّ یہ کہ متن اور اس کے سیاق وسباق کا تقاضا ہو۔

(ا) گورنمنٹ: سے مراد پنجاب گورنمنٹ ہے۔

(ب) شخصی قرض دہندہ: سے مراد وہ شخص ہے جو سود پر لوگوں کو قرض دے۔ تاہم اس میں وفاقی یا صوبائی حکومت کی اجازت سے کام کرنے والے بنک، مالیاتی کارپوریشن اور کوآپریٹو سوسائٹیاں شامل نہیں ہوں گی۔

(ج) سود: سے مراد وہ رقم ہے جو قرض کے لیے دی گئی رقم سے زائد ہو اور اس کا مطالبہ کیا جارہا ہو، خواہ اسے سود کا نام دیا گیا ہو یا نہ دیا گیا ہو۔

4- شخصی سودی قرض کی ممانعت: صوبہ پنجاب میں کسی شخص کو خواہ وہ انفرادی طور پر ہو یا اجتماعی طور پر سودی قرض دینے کی اجازت نہیں ہوگی۔

5- سزا: جو شخص اس ایکٹ کی دفعہ ۳ محولہ بالا کی خلاف ورزی کرے گا (یعنی سود پر قرض دے گا) اسے ۱۰ سال تک کی قید یا پانچ لاکھ روپے جرمانہ یا دونوں پر مشتمل سزا دی جائے گی۔

6- ناقابل ضمانت جرم: اس ایکٹ کے تحت جرم کا ارتکاب ناقابل ضمانت اور ناقابل صلح ہے۔

7- دائرہ کار: اس ایکٹ کی دفعہ ۳ کی خلاف ورزی قابل دست اندازی پولیس جرم ہوگا حسب کریمنل پروسیجر کوڈ ۱۸۹۸ء (ایکٹ ۵ آف ۱۸۹۸ء) کی سیکشن دفعہ (۳) کی ذیلی دفعہ (۱)۔

8- قواعد وضوابط: حکومت (پنجاب) اس ایکٹ پر عمل درآمد کے لیے (تفصیلی) قواعد وضوابط بنا سکتی ہے۔

9- تنیخ: (اس ایکٹ کے نفاذ کی وجہ سے) پنجاب قرض دہندگی آرڈی ننس ۱۹۶۰ء (ڈبلیوپی آرڈی ننس ۲۴ آف ۱۹۶۰ء) منسوخ سمجھا جائے گا۔

10- تحفظ: پنجاب قرض دہندگی آرڈی ننس ۱۹۶۰ء (ڈبلیوپی آرڈی ننس ۲۴ آف ۱۹۶۰) کی تنیخ سے قطع نظر، اس آرڈی ننس کے تحت یا اس کے حوالے سے جو کچھ بھی کیا گیا، جو ایکشن لیے گئے، جن حقوق وواجبات کا تعین کیا گیا، جو تعیناتیاں شامل کی گئیں، جو اختیارات تفویض کیے گئے، جو فیصلے کیے گئے اور جو (تفصیلی) قواعد و ضوابط وضع کیے گئے وہ سب اس ایکٹ کے تحت انجام دیے گئے متصور ہوں گے۔

مجلہ / مقام / زیراہتمام:

روزنامہ اسلام، لاہور

تاریخ اشاعت: ۲۰ جنوری ۲۰۱۶ء

اور اب دینی سرگرمیوں پر پابندی !

ملک کے تمام مذہبی مکاتب فکر نیشنل ایکشن پلان کے تحت دہشت گردی کے خاتمہ کی جدوجہد میں حکومت سے بھرپور تعاون کر رہے ہیں اور ہر سطح پر اس کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دینی حلقوں میں یہ احساس بھی بڑھتا جا رہا ہے کہ اس سلسلہ میں وہ امتیازی سلوک کا نشانہ بنے ہوئے ہیں کیونکہ یوں نظر آتا ہے کہ اس ایکشن پلان کا بڑا ہدف دینی جماعتوں کی

سرگرمیوں کو روکنا اور انہیں کارنر کرنا ہے۔ اور اس کے لیے قانونی و غیر قانونی سرگرمیوں اور دہشت گردی کے خلاف ایکشن میں تعاون کرنے والوں اور نہ کرنے والوں کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا جا رہا اور سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جا رہا ہے۔

ضلع گوجرانوالہ کی حد تک یہ احساس اس وقت شدت اختیار کر گیا جب ۵ فروری کو ''یوم یک جہتی کشمیر'' کے موقع پر بعض عوامی ریلیوں کو صرف اس لیے پولیس کے ذریعہ روکنے کی کوشش کی گئی کہ ان کا اہتمام بعض دینی جماعتوں کی طرف سے کیا گیا تھا، جبکہ اس سے دو روز بعد ۷ فروری کو نیو سبزی منڈی بائی پاس روڈ کے قریب ایک دینی مدرسہ جامعہ قاسمیہ میں تحفظ ختم نبوت اور یک جہتی کشمیر کے عنوان سے منعقد ہونے والے سیمینار پر پابندی لگا دی گئی۔ حالانکہ یہ سیمینار چار دیواری کے اندر اور مسجد کی حدود میں منعقد ہو رہا تھا مگر ایک روز قبل ہی ضلعی انتظامیہ کی طرف سے کہہ دیا گیا کہ اس سیمینار کے انعقاد کی اجازت نہیں ہے۔ اس سیمینار سے عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی راہنما مولانا اللہ وسایا اور راقم الحروف نے خطاب کرنا تھا، چنانچہ اسے منسوخ کر دیا گیا اور مولانا اللہ وسایا کو گوجرانوالہ تشریف آوری کے بعد خطاب کیے بغیر واپس جانا پڑا۔

اس کاروائی نے دینی حلقوں کو دو حوالوں سے بطور خاص مضطرب اور بے چین کر دیا ہے، ایک یہ کہ دینی راہ نماؤں کو اب آزادئ کشمیر اور تحفظ ختم نبوت کے حوالہ سے بات کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ مسجد کی حدود کے اندر کوئی محدود اجتماع بھی ضلعی انتظامیہ کی مرضی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ ہمارے ہاں یہ روایت چلی آ رہی ہے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ قائم رہے گی کہ چار دیواری کے اندر اور مسجد کی حدود میں منعقدہ کسی اجتماع کے لیے اجازت نہیں لی جاتی۔ البتہ اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز مسجد اور چار

دیواری کی حدود سے باہر نہ جائے۔ مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں گزشتہ نصف صدی سے یہ روایت قائم ہے کہ ہم کسی بھی اجتماع کے لیے بالائی لاؤڈ اسپیکر استعمال نہیں کرتے اور آواز کو چار دیواری کے اندر محدود رکھنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جبکہ اس کے ساتھ کسی اجتماع کے لیے اجازت لینے کے بھی ہم کبھی روادار نہیں رہے۔ البتہ جامعہ قاسمیہ کا مذکورہ پروگرام صرف اس لیے منسوخ کر دیا گیا کہ ہم موجودہ حالات میں انتظامیہ کے ساتھ کسی قسم کی محاذ آرائی نہیں چاہتے مگر اس کا بہت غلط فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

اس پس منظر میں جمعیۃ علماء اسلام (ف)، جمعیۃ علماء اسلام (س)، مرکزی جمعیۃ اہل حدیث، جماعت اسلامی، جمعیۃ العلماء پاکستان نورانی گروپ، مجلس احرار اسلام، مجلس تحفظ ختم نبوت، پاکستان شریعت کونسل، جماعت اہل سنت، جمعیۃ اہل سنت اور دیگر جماعتوں کے سرکردہ راہ نماؤں کے دو مشترکہ اجلاس مرکزی جامع مسجد میں ہو چکے ہیں جن میں طویل مشاورت کے بعد تمام راہ نماؤں نے ایک مشترکہ ہنگامی پریس کانفرنس میں اپنے فیصلوں کا اعلان کیا جس کا متن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

''گوجرانوالہ کے مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام اور دینی راہ نماؤں نے نیشنل ایکشن پلان کے حوالہ سے دینی مدارس، کارکنوں اور راہ نماؤں کے خلاف گھیراتنگ کرنے کی پالیسی کے خلاف احتجاج کے طور پر رائے عامہ کو منظم کرنے کے لیے ''متحدہ علماء ایکشن کمیٹی'' قائم کرنے کا اعلان کیا ہے جس کے کنوینر مولانا حافظ محمد عمران عریف اور سیکرٹری چودھری بابر رضوان باجوہ ہوں گے اور ان کے ساتھ تمام مکاتب فکر کے نمائندوں پر مشتمل رابطہ کونسل قائم کی گئی ہے۔ ۱۰ فروری کو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں متحدہ علماء ایکشن کمیٹی کے زیر اہتمام ہنگامی پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا زاہد الراشدی، مولانا محمد سعید

کلیروی، مولانا حافظ محمد عمران عریف، مولانا اظہر حسین فاروقی، مولانا حافظ گلزار احمد آزاد، مولانا شبیر احمد صدیقی، علامہ کاظم علی ترابی، حافظ ابرار احمد ظہیر، چودھری بابر رضوان باجوہ، جناب فرقان عزیز بٹ، اور دیگر راہ نماؤں نے کہا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف نیشنل ایکشن پلان پر عملدرآمد میں مکمل تعاون کے باوجود دینی اداروں اور شخصیات کو قانون اور آئین سے ماوراء کاروائیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، اور دینی مدارس پر بے نتیجہ چھاپوں کے ساتھ ساتھ علماء اور کارکنوں کو اٹھا کر خوف و ہراس کی فضا قائم کی جا رہی ہے۔ جبکہ دینی اقدار و روایات پامال کرنے والے عناصر کو کھلی چھٹی دے دی گئی ہے۔

انہوں نے اس بات پر شدید احتجاج کیا کہ گزشتہ دنوں گوجرانوالہ میں ایک دینی مدرسہ جامعہ قاسمیہ کی چار دیواری کے اندر تحفظ ختم نبوت اور یک جہتی کشمیر کے عنوان پر سیمینار کے انعقاد کو روک دیا گیا اور کشمیر کے ساتھ یک جہتی کے اظہار کے لیے مختلف دینی جماعتوں کی ریلیوں کو پولیس کے ذریعہ روکنے کے لیے کوشش کی گئی۔ انہوں نے کہا کہ عقیدۂ ختم نبوت، ناموس رسالتؐ، اور آزادئ کشمیر ہمارے متفقہ قومی مسائل ہیں۔ ان کے حوالہ سے قانون کی حدود میں کی جانے والی سرگرمیوں پر کسی قسم کی پابندی برداشت نہیں کی جائے گی۔ اس سلسلہ میں دینی جماعتوں کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک قابل قبول نہیں ہوگا اور دینی اقدار و روایات کے تحفظ و پاسداری کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا جائے گا۔ انہوں نے وفاقی حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس حوالہ سے پنجاب کی صورت حال کا بطور خاص نوٹس لیا جائے، کیونکہ دینی اداروں اور شخصیات کے خلاف اس قسم کی کاروائیوں کی صورت حال دوسرے صوبوں میں عام طور پر نہیں پائی جاتی۔

انہوں نے اعلان کیا کہ ۲۰ فروری بروز ہفتہ حکومت کے ان اقدامات کے خلاف مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں بعد نماز ظہر احتجاجی کنونشن منعقد کیا جائے گا جس میں تمام مکاتب فکر اور دینی جماعتوں کے سرکردہ راہ نما خطاب کریں گے اور ''متحدہ علماء ایکشن کمیٹی'' کے آئندہ لائحہ عمل کا اعلان کیا جائے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مجلہ / مقام / زیراہتمام:

روزنامہ اسلام، لاہور

تاریخ اشاعت:

۱۲ فروری ۲۰۱۶ء

نفاذ شریعت کے لیے علماء اور وکلاء کی مشترکہ جدوجہد کی ضرورت

2، 3، 4 مئی کو کراچی، حیدر آباد، میرپور خاص اور خیرپور میں مختلف دینی مدارس کی سالانہ تقریبات میں شرکت کا موقع ملا جس کی کچھ ضروری تفصیلات چند کالموں میں عرض کرنے کی کوشش کروں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ سردست ایک محفل کا ذکر کر رہا ہوں جس کا اہتمام ہمارے پرانے دوست جناب محمد اسلم شیخ ایڈووکیٹ نے 3 مئی کو سیشن کورٹ میرپور خاص کے بار ہال میں سرکردہ وکلاء کے ساتھ ایک نشست کی صورت میں کیا تھا۔ پاکستان شریعت کونسل پنجاب کے سیکرٹری اطلاعات حافظ محمد بلال فاروقی میرے رفیق سفر تھے، وکلاء کے ساتھ اس ملاقات و گفتگو میں جو کچھ عرض کیا اس کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ محمد اسلم شیخ ایڈووکیٹ ہمارے پرانے ساتھیوں میں سے ہیں، دینی جدوجہد اور تحریکات میں ہماری رفاقت گزشتہ چار عشروں سے چلی آرہی ہے، ان کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے آپ حضرات کے ساتھ اس ملاقات کا موقع فراہم کیا ہے اور میں دل کی چند باتیں آپ کے سامنے عرض کرنے کے لیے اس سے فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ شیخ صاحب محترم نے ابھی میرا تعارف کراتے ہوئے ایک لمبی چوڑی فہرست آپ کے سامنے ذکر کی ہے جسے میں ان کے حسن ظن اور حوصلہ افزائی پر محمول کرتے ہوئے یہ گزارش کر رہا ہوں کہ میں صرف ایک ''مولوی'' ہوں اس کے سوا کچھ نہیں ہوں۔ اور آپ حضرات چونکہ وکیل ہیں اس لیے ''مولوی'' اور ''وکیل'' کے تعلقات کے بارے میں چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

مولوی شریعت اسلامیہ کے علوم و قوانین کی نمائندگی کرتا ہے جبکہ آپ حضرات آج کے رائج الوقت قوانین اور قانونی نظام کے نمائندہ ہیں۔ جب پاکستان قائم ہوا تھا اور یہ طے پایا تھا کہ مروجہ دستوری اور قانونی نظام کو قائم رکھتے ہوئے اس میں ضروری اصلاحات کے ساتھ ملک میں شرعی احکام و قوانین کی عملداری کا اہتمام کیا جائے گا اور ملک کے تمام طبقات نے اس سے اتفاق کر لیا تھا تو یہ بات ناگزیر ضرورت کا درجہ اختیار کر گئی تھی کہ مولوی اور وکیل مل بیٹھیں اور باہمی مشورہ و مفاہمت کے ساتھ اس قومی خواہش اور ایجنڈے کی تکمیل کی کوئی عملی صورت نکالیں۔ کیونکہ زمینی حقیقت یہ ہے کہ مولوی دینی علوم اور شریعت کے قوانین کا علم تو رکھتا ہے مگر مروجہ قوانین اور قانونی نظام کا علم اس کے پاس نہیں ہے۔ جبکہ وکیل مروجہ قوانین اور قانونی نظام کا علم و تجربہ تو رکھتا ہے مگر شریعت کے قوانین و احکام اس کے علم کے دائرہ میں شامل نہیں ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ مولوی اور وکیل دونوں مل کر اس ذمہ داری کو قبول

کریں اور اس کے لیے کام کریں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جس کی وجہ سے ملک میں دستور اور قانون و شریعت میں سے کسی کی حکمرانی ابھی تک عملاً قائم نہیں ہو سکی۔

اس کے برعکس ہمارے درمیان طبقاتی انا اور نفسیات کی جو خلیج حائل تھی وہ مزید گہری ہوتی چلی گئی اور ہم دونوں طبقے آج بھی ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنے اور ایک دوسرے کو قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں ہیں۔ میں اس پر قومی تاریخ کے دو اہم واقعات کی طرف آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہوں گا جو اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مولوی اور وکیل کے درمیان طبقاتی انا اور نفسیاتی برتری کی کس قدر گہری خلیج حائل ہے۔

جس زمانے میں مالاکنڈ ڈویژن میں صوفی محمد صاحب کی تحریک نفاذ شریعت محمدیؐ کا زور و شور تھا اور وہ لاکھوں عوام کو سڑکوں پر لا کر صوبائی حکومت سے نفاذ شریعت کا ایک ریگولیشن حاصل کر چکے تھے، میں نے اس دور میں مالاکنڈ ڈویژن کا دورہ کر کے رپورٹ لکھی تھی جو روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے کہ صوبائی حکومت کی طرف سے عوامی مطالبہ پر جاری کیے جانے والے نفاذ شریعت ریگولیشن کا اردو ترجمہ میں نے جب پڑھا تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ اس میں لفظی ہیر پھیر کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے تحریک نظام شریعت محمدیؐ کے ذمہ دار حضرات سے بات کی تو انہوں نے فرمایا کہ چونکہ یہ اصل انگریزی میں تھا اس لیے ہم پڑھ نہیں سکے اور ہمیں جب بتایا گیا کہ اس میں آپ کے سارے مطالبات شامل ہیں تو ہم نے اس پر دستخط کر دیے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کو اپنے ماحول میں سمجھدار اور دین دوست وکلاء میسر نہیں تھے کہ آپ ان سے راہ نمائی حاصل کر لیتے؟ تو جواب ملا کہ ہم نے ان کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

میں نے اپنے میزبان سے کہا کہ ہائی کورٹ کے کسی وکیل اور انتظامیہ کے اعلیٰ افسران سے اس

سلسلہ میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں تو انہوں نے ڈی آئی جی پولیس اور ہائی کورٹ کے ایک سینئر وکیل سے ملاقات کا اہتمام کر دیا۔ محترم وکیل صاحب سے میں نے پوچھا کہ آپ کے سامنے یہ ساری تحریک چل رہی تھی اور آپ بھی شریعت کے نفاذ سے دلچسپی رکھتے ہیں تو آپ نے آگے بڑھ کر راہ نمائی کیوں نہیں کی اور اس میں شریک کیوں نہیں ہوئے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم چند وکلاء تحریک کے قائدین سے ملے تھے اور اپنی خدمات پیش کی تھیں مگر ہمیں یہ کہا گیا کہ یہ علماء کرام کا کام ہے آپ حضرات کا نہیں، اس لیے ہم واپس آگئے۔ میں نے دیکھا کہ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے ان وکیل صاحب کی آنکھیں نم آلود ہو گئی تھیں۔

دوسری طرف کا حال بھی دیکھ لیجیے جو آزاد کشمیر کے سابق صدر و وزیر اعظم سردار محمد عبد القیوم خان مرحوم نے مجھے خود ذاتی طور پر بتایا کہ جب انہوں نے آزاد جموں و کشمیر میں سیشن جج اور شرعی قاضی پر مشتمل مشترکہ عدالتی نظام تشکیل دینے کا فیصلہ کیا تاکہ جج صاحبان اور علماء کرام مل بیٹھ کر شریعت اور قانون کی روشنی میں مشترکہ طور پر مقدمات کے فیصلے کریں تو ریاستی سطح پر ایک بڑی مشترکہ میٹنگ میں جج صاحبان کی طرف سے یہاں تک کہہ دیا گیا کہ ہم مولوی کو اپنے ساتھ بٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اگر ایسا کیا گیا تو ہم سب مستعفی ہو جائیں گے۔

سردار صاحب مرحوم نے کہا کہ میں چونکہ یہ فیصلہ کر چکا تھا اور اس کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھا تو میں نے صاف کہہ دیا کہ یہ نظام تو بہر حال نافذ ہوگا، جو ساتھ نہیں چلنا چاہتا ہے وہ ابھی اسی اجلاس میں استعفیٰ لکھ کر گھر واپس چلا جائے۔ چنانچہ استعفیٰ تو کسی نے نہیں دیا مگر شریعت اور مروجہ قانون کے نمائندوں پر مشتمل مشترکہ عدالتی نظام آج بھی آزاد کشمیر میں کام کر رہا ہے اور اس سے ریاست کے عوام مستفید ہو رہے ہیں۔ میری رائے میں ملک بھر کے

وکلاء، جج صاحبان، علماء کرام اور دینی کارکنوں کو اس سسٹم کا مطالعہ اور اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔

یہ دو واقعات میں نے یہ بتانے کے لیے عرض کیے ہیں کہ ہمارے درمیان طبقاتی منافرت اور انا کا یہ ماحول ابھی تک قائم ہے۔ اور میرے نزدیک ملک میں دستور و قانون اور شریعت کی حکمرانی کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے۔ اس لیے محترم وکلاء کے ساتھ آج کی اس ملاقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کو اس کا احساس کرنا چاہیے اور ایک دوسرے کی طرف آگے بڑھنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم ملک و قوم کو قانون و شریعت کی عملداری کے ٹریک پر نہیں لا سکتے۔ جبکہ اس سلسلہ میں اپنی اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ کرتے ہوئے ہم دونوں خدا، قوم اور تاریخ کے مجرم ہوں گے۔

مجلہ / مقام / زیر اہتمام:

روزنامہ اسلام، لاہور

تاریخ اشاعت:

۸ مئی ۲۰۱۶ء

دینی تحریکات کی ناکامی کا ایک سبب

گزشتہ روز مولانا عبد الرؤف ملک، مولانا ڈاکٹر سرفراز احمد اعوان، مخدوم منظور احمد تونسوی اور دیگر احباب کے ہمراہ منصورہ حاضری ہوئی اور ہم نے جماعت اسلامی پاکستان کے نائب امیر جناب حافظ محمد ادریس، صوبہ سندھ کے امیر جناب اسد اللہ بھٹو اور دیگر قائدین سے مولانا مطیع الرحمن نظامی کی مظلومانہ شہادت پر تعزیت اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دیں اور عالم اسلام میں ابتلاء و آزمائش سے دوچار تمام حضرات کو صبر و استقامت کے ساتھ سرخرو فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

چونکہ ہم سب منصورہ میں جمع تھے اس لیے چند روز قبل منصورہ میں منعقد ہونے والے تمام مکاتب فکر کے قائدین کے اجتماع اور اس میں تحریک نظام مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی بحالی اورپنجاب اسمبلی سے حال میں منظور ہونے والے تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کی غیر شرعی شقوں کوتبدیل کرانے کے لیے مشترکہ جدوجہد کے عزم و اعلان کے حوالہ سے بہت سی باتیں باہمی گفتگو کا حصہ بنیں۔

تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کے بارے میں ہمیں بتایا گیا کہ چونکہ اسلامی نظریاتی کونسل نے تحفظ حقوق نسواں بل کا شق وار جائزہ لے کر اسے مسترد کر دیا ہے اس لیے مشترکہ فورم پر بھی اسی موقف کو اپنانے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور اس کے بارے میں 16 مئی کو ہونے والے مشترکہ اجلاس میں پیش رفت ہوگی۔ میں نے اس حوالہ سے دوستوں کے ساتھ اہم نکات پر گفتگو میں عرض کیا کہ خاندانی نظام کی شرعی بنیادوں کے تحفظ کی جدوجہد میں ہم مرحلہ وار پسپائی اختیار

کرتے جا رہے ہیں اور اس پسپائی کو روکنے کی مجھے اب بھی کوئی عملی صورت دکھائی نہیں دے رہی۔

1- عائلی قوانین کا سلسلہ گزشتہ نصف صدی سے جاری ہے اور تمام مکاتب فکر کی طرف سے اس کی بعض شقوں کو خلاف اسلام قرار دیے جانے کے باوجود اس کی صفائی و تطہیر کا کام مکمل نہیں ہو سکا۔

2- جنرل پرویز مشرف کے دور میں تحفظ حقوق نسواں کے عنوان سے حدود آرڈیننس کا تیا پانچہ کر دیا گیا اور ہم اس پر وقتی اور زبانی احتجاج سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ اس موقع پر ملک کے تمام مکاتب فکر کی دینی قیادتیں جامعہ اشرفیہ لاہور میں اکٹھی ہوئی تھیں اور تحفظ حدود شرعیہ کے عنوان سے مشترکہ تحریک کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ مگر اس وقت کی اجتماعی دینی قیادت (متحدہ مجلس عمل) نے آگے بڑھ کر اس جدوجہد کو اپنے ہاتھ میں لینے کا عزم ظاہر کیا، مذکورہ بالا بل کے پارلیمنٹ میں منظور ہونے کی صورت میں اسمبلیوں کی رکنیت سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا، اور پارلیمنٹ کے اندر پوری قوت کے ساتھ مزاحمت کا عندیہ دیا۔ مگر جب یہ بل پاس ہوگیا تو نہ کسی نے استعفیٰ دیا اور نہ ہی کوئی احتجاج منظم کیا گیا اور سارا معاملہ ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیا گیا۔

کسی عوامی تحریک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی ''پن'' نکال دینے کا یہ نسخہ اس قدر کارگر ثابت ہوا کہ اس کے بعد بھی مختلف مراحل میں اسے کامیابی کے ساتھ دہرایا جا چکا ہے۔ جبکہ ایک غریب و بے نوا کارکن کے طور پر مجھے اب بھی اسی کا خطرہ دکھائی دے رہا ہے۔

3- خاندانی نظام کے حوالہ سے ہم اب تک جزئیات و فروعات پر لڑ رہے ہیں جبکہ میری طالب علمانہ رائے میں اس کی اصولی بنیادوں پر بے لچک موقف اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مغرب نے معاشرتی زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح خاندانی نظام کو بھی آسمانی

تعلیمات اور وحی الٰہی کی ہدایات سے مستثنیٰ کر لیا ہے۔ اور خاندانی قوانین طے کرنے میں اس کی واحد بنیاد سوسائٹی کی خواہشات اور سوچ ہے جسے کلچر سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ مسلمانوں کے خاندانی نظام کی بنیاد وحی الٰہی اور قرآن و سنت کے احکام و قوانین پر ہے جس سے دستبردار ہونے کے لیے مسلم سوسائٹی دنیا میں کسی جگہ بھی تیار نہیں ہے۔ عالمی اداروں کی طرف سے کیے جانے والے تازہ ترین عوامی سروے بھی یہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کی غالب اکثریت (نوے فیصد کے لگ بھگ) نکاح، طلاق اور وراثت جیسے خاندانی معاملات میں قرآن و سنت کے احکام و قوانین کو ہی بنیاد تسلیم کرتی ہے۔ اور اس سے دستبردار ہونے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ مگر اس بنیادی حقیقت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے مسلمانوں کے خاندانی نظام کو مغرب کے خاندانی نظام کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی ضد مسلسل جاری ہے۔

4- مسلم معاشرہ کی صورت حال باقی دنیا سے قطعی مختلف ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان اپنے عقیدہ و ایمان کے حوالہ سے بھی قرآن و سنت کی پابندی کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ اور اگر عوامی اکثریت کی رائے کو ان کا کلچر اور تمدن سمجھا جائے تو وہ کلچر و ثقافت کی رو سے بھی قرآن و سنت کے دائرے میں رہنا چاہتے ہیں۔ اس لیے مغرب کے ساتھ دوٹوک بات کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنا کلچر ہم پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کرے اور ہمارے عقیدہ و ایمان اور خاندانی نظام میں مداخلت کا سلسلہ چھوڑ دے۔

5- اسی طرح مسلم معاشرہ میں مغرب کی نمائندگی کرنے والے دانشوروں کو بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ قرآن و سنت اور شریعت اسلامیہ کی من مانی تعبیرات کر کے انہیں مغربی فکر و فلسفہ کے فریم میں فٹ کرنے کا عمل بھی مسلم سوسائٹی نے دنیا میں ہر جگہ مسترد کر دیا ہے۔ کیونکہ عام مسلمان اب بھی قرآن و سنت کی اسی تعبیر و تشریح کے ساتھ وابستہ ہے جو چودہ سو

سال سے اجتماعی تعامل کی صورت میں چلی آرہی ہے۔ اس صورت حال کو تبدیل کرنا عالم اسباب میں بھی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک قرآن و سنت اور شریعت اسلامیہ کی اوریجنل تعلیمات مسلم معاشرہ میں موجود ہیں اور پڑھی و پڑھائی جا رہی ہیں۔ اس لیے وہ قرآن و سنت کی تعلیمات کو اپنے ڈھب پر لانے کی اس ناکام کوشش میں خواہ مخواہ اپنا اور مسلمانوں کا مزید وقت ضائع نہ کریں اور اس سراب کے پیچھے بھاگنا بند کر دیں جو مغرب کے فکر و فلسفہ نے ان کے ذہنوں پر مسلط کر رکھا ہے۔

مجلہ / مقام / زیر اہتمام:

روزنامہ اسلام، لاہور

تاریخ اشاعت:

۱۴ مئی ۲۰۱۶ء